ہندومت اور اسلام

مشترکہ اقدار اور پیرکاروں کے باہمی تعامل کی تاریخ

مصنف

حافظ محمد شارق

باامتمام

ادارہ تحقیقات مذاہب

-

ہندومت اور اسلام

﴿مشترکہ اقدار اور پیرکاروں کے باہمی تعامل کی تاریخ﴾

مصنف

حافظ محمد شارق

بااہتمام

ادارہ تحقیقاتِ مذاہب

-

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

کتاب	:	ہندومت اور اسلام
مصنف	:	حافظ محمد شارق سلیم
رابطہ مصنف	:	hmshariq@gmail.com, 0347-2005680
سالِ اشاعت	:	اکتوبر 2013
سالِ اشاعتِ دوم	:	ستمبر 2014

-

انتساب

والدہ محترمہ کے نام...!

جن کی محبت و شفقت نے مجھے

زندگی کی ناگوار تلخیوں سے محفوظ رکھا۔

-

فہرست

تعارف.....12

گذارشات.....14

حصہ اوّل: ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعامل کی تاریخ.....16

مطالعہ تاریخ کے مناہج.....16

باب 1: ہِند میں اسلام کا ابتدائی تعارف.....19

قدیم عرب و ہند.....19

عہد نبوی ﷺ اور عہد خلافت.....22

ہند میں صحابہ کی آمد.....28

محمد بن قاسم کا دور.....30

سندھ کی فتح.....33

محمد بن قاسم اور ہنود.....36

-

اشاعت اسلام 40

خلافت عباسیہ میں ہنود..... 42

زیر بحث دور میں ہندوستان میں مسلمان 44

سندھ کی خلافتِ اسلامیہ سے علیحدگی 47

باب2: محمود غزنوی کا زمانہ، مقدمات.....48

ہندو مسلم تصادم کا بیانیہ..... 49

مندروں کی تباہی..... 50

باب3: محمود غزنوی اور غوری حملہ 54

محمود غزنوی 54

محمود اور ہندوستان 56

گجرات اور سومناتھ پر حملہ (1024CE)..... 60

محمود غزنوی اور ہنود 62

محمود غزنوی اور ہندو مندر 66

ہندوستان؛ محمود کے بعد 68

غوری یلغار 69

محمود اور غوری کے حملوں کا اثر..... 73

زیر بحث دور میں ہندوستان میں مسلمان 75

ہندو امرائے سلطنت اور غیر ہنود..... 79

باب4:وسطی عہد 81

سلاطین دہلی 81

مغلیہ دور 86

بابر اور ہمایوں کا عہد 87

اکبری دور میں ہندوؤں سے اچھا سلوک 89

جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں ہنود 92

اورنگ زیب عالمگیر اور ہنود..... 94

ہندوؤں سے جنگ..... 96

ہندوؤں پر جزیہ لگانا 98

ہندوؤں کو ملازمتوں سے نکالنا..... 99

مندروں کو مسمار کرنا..... 99

ہندوؤں کے جلوسوں پر پابندی 103

عالمگیر کے دیگر اصلاحی اقدامات 104

مسلم عہد حکومت کا مجموعی جائزہ 105

باب5:برطانوی قبضہ سے عصرِ حاضر تک.....112

انگریزی دور میں ہندو اور مسلمان 112
انگریزوں کے اثرات 113
تقسیم ہند 116
موجودہ صورت حال 118
ہندوستان میں مسلمان 118
پاکستان میں ہنود 122

حصہ دوم: 125

ہندومت اور اسلام کا تعلق 125

باب6: ہندوؤں کے بارے میں اسلام کا موقف 126

ہندوؤں کے لیے پیغمبر بھیجے گئے؟ 127
کیا ہندو اہل کتاب ہیں؟ 128
ہندو مقدس شخصیات کے بارے میں اسلام کا موقف 130

باب7: ہندومت کے اہم عقائد ورسوم: اسلام کا موقف 132

اسلام اور ہندومت کا تصور خدا 132

توحید کے دلائل 135
عقیدہ اوتار اور قرآن 140
بت پرستی 141
طبقاتی نظام 142
تناسخ اور اسلام 144

باب8: ہندومت اور رسالت و نبوت 146

قصہ آدم و حواء علیہما السلام۔۔۔ 150
تخلیق آدم علیہ السلام 150
علم الاسماء 154
آدمؑ کو سجدہ 156
حواء کی تخلیق 157
شجرِ ممنوعہ، مکرِ ابلیس اور نزول آدم علیہ السلام 158
آدمؑ کہاں اترے؟ 161
ستیا، تیترا اور دواپر یگ 167
حضرت نوح علیہ السلام 168
ہندو قوم اور حضرت نوح علیہ السلام 170
طوفانِ نوح اور ہنود 173

بھوشیہ پران کی تاریخ 177

باب9: انتم اوتار اور محمد ﷺ 178

حضرت محمد ﷺ اور ہندوؤں مقدس کتابیں 178

رگ وید میں ذکر مبارک 182

اوصاف حمیدہ 187

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مقام 188

اتھر وید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک 189

سام وید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک 194

اپنشد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک 195

پرانوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک 197

کلکی اوتار اور حضرت محمد ﷺ 198

پیش گوئیوں کے بارے میں پنڈت حضرات کا موقف 206

کلکی کی وہ صفات جو ہنود کے مطابق آپ پر صادق نہیں آتی 206

باب8: سناتن دھرم اور دین قیّم 209

توحید 210

ہندو مذہب میں تبدیلی کیونکر ہوئی؟ 211

حصہ سوم: 214

ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں کو اسلام کی دعوت 214

باب10: ہندو مسلم اتحاد: درپیش مسائل اور ان کا حل 215

بابری مسجد 215

گائے ذبح کرنا 217

میڈیا کا منفی کردار 218

ہندو مسلم تعلقات اور سیاسی مسائل 218

تعصبانہ تاریخ 219

فسادات 222

فسادات کے مسئلے کا حل 224

باب11: ہندو قوم اور دعوتِ دین 228

ہندوؤں کو دعوت کیوں ضروری ہے؟ 228

خیر الامم 228

امت وسط 229

کتمانِ حق کا ظلم 230

حقِ ہمسائیگی 230

ہندوؤں کی موجودہ نفسیات اور دعوتی حکمت عملی 231

تاریخ سے آگہی 231

دعوتِ توحید 232

توہمات اور غیر مناسب تعلیمات سے آگہی 232

مقدس شخصیات کی بے حرمتی 233

سیاسی مسائل میں پیچھے ہٹنے کی ضرورت 233

سنسکرت سیکھنے کی ضرورت 234

معروف اصطلاحات کا استعمال 235

پروپیگنڈہ کا مقابلہ 236

اسلام کی صحیح تعبیر 237

اخلاص و محبت 238

حوالہ جات و کتابیات 239

-

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر نظر کتاب ''ہندومت کا تفصیلی مطالعہ'' کا دوسرا حصہ ہے جس کا موضوع ہندومت، اسلام اور ان کے پیروکاروں کا باہمی تعلق ہے۔ اس کتاب میں مختلف پہلوؤں سے ہندومت اور اسلام کے باہمی تعلق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی ترتیب و تقسیم حسب ذیل انداز میں کی گئی ہے۔

- پہلا حصہ ہندو اور اسلام کے تاریخی تعامل کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں عہد نبوی، محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے لے کر مغلیہ دور اور دورِ حاضر کی تاریخ کا مطالعہ ہے۔
- دوسرے حصے میں ہندومت اور اسلام کے باہمی تعلق کا ذکر ہے۔ اس میں ہندومت اور اس کے رسوم و عقائد کے بارے میں اسلام کا موقف، ہندومت میں توحید، رسالت، آخرت، نبوتِ محمدی اور دیگر اسلامی نظریات کا مطالعہ کریں گے۔
- تیسرے یعنی آخری حصے کا بنیادی موضوع ہندوؤں کو دین اسلام دعوت دینے کے طریقہ کار اور اس کی حکمت عملی سے متعلق ہے۔ اسی ضمن میں ہم ہندو مسلم اتحاد میں درپیش مسائل اور ان کے حل کا بھی مطالعہ کریں گے۔

اس کتاب کے مصنف حافظ محمد شارق صاحب، جو ہماری ٹیم کے انتہائی محنتی رکن ہیں، خصوصی شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں۔ ہم مالک و خالق کے مشکور ہیں جس نے ادارے کو یہ تحقیقی مواد پیش کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مصنف کی اس علمی و دینی خدمت کو محض اپنے فضل و کرم س شرف قبولیت عطا فرمائے اور اسے انسانیت کے لیے اسے نفع کا سبب بنائے۔ آمین۔

31 اگست 2014

شایان سرور، اِنلائٹن پبلیکیشنز،

-

گذارشات

تقابل ادیان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہندومت اور اسلام سے میرا خاص موضوع ہے جس کا مطالعہ کئی برسوں سے کررہا ہوں۔ اس مطالعے کا حاصل میں اپنی گذشتہ کتاب "ہندو مت کا تفصیلی مطالعہ" میں پیش کرچکا ہوں۔ اُس کتاب کی ترتیب کے دوران میرے سامنے کئی ایسی روایات گزریں جہاں دونوں مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اِن میں سے بعض روایات کو میں مختصر طور پر اپنی مذکورہ تصنیف میں بیان کرچکا ہوں؛ لیکن اسی وقت سے مجھے یہ محسوس ہورہا تھا کہ یہ موضوع ایک علیحدہ تصنیف کا محتاج ہے۔ اس کے علاوہ دعوتی نقطہ نظر سے بھی ایک ایسی رہنما کتاب کی اشد ضرورت تھی جس میں دونوں مذاہب اوران کے پیروکاروں کے باہمی تعلق بالخصوص ان کا تاریخی تعامل اور مشترکہ اقدار کو تفصیل سے بیان کردیا جائے تاکہ برصغیر میں رہنے والی ان دونوں قوموں کے مابین محبت و اتحاد اور دعوتی رشتے کو فروغ دیا جاسکے۔

زیر نظر کتاب دراصل اسی ضمن میں ایک کاوش ہے جس میں مختلف تاریخی اور مذہبی حقائق و روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ہندومت اور اسلام کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کو بھی تفصیل سے زیرِ بحث لایا گیا ہے جس کا مقصد تاریخ کے متعلق دونوں قوموں میں موجود غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے۔

اپنے قارئین کے سامنے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے بلکہ یہ سب وہ معلومات ہیں جو مذاہب عالم کے مذہبی ماخذ اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، لیکن یہاں ان معلومات کو ایک نئے تحقیقی زاویۂ نگاہ سے پیش کیا گیا جس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کس طرح اسلام اور ہندومت ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں اپنے استاد محترم مبشر نذیر صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے کتاب کا مجوزہ خاکہ دیکھ کر کئی اہم امور کی طرف رہنمائی فرمائی اور کئی مفید مشوروں سے نوازا۔ اگر ان کی رہنمائی شامل حال نہ ہوتی تو کتاب میں کئی نمایاں اغلاط رہی جاتی اور کتاب کی افادیت میں خاصی کمی ہوتی۔

میں اہل علم سے قوی امید رکھتا ہوں کہ وہ میری اس تحقیقی کاوش کو سراہیں گے اور جہاں کہیں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہو اس بارے میں مجھے مطلع کریں گے۔ اللہ سب کے ایمان و عمل کی حفاظت فرمائے اور ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائے رکھے۔ (آمین)

حافظ محمد شارق 31 اگست 2013

-

حصہ اوّل: ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعامل کی تاریخ

مطالعہ تاریخ کے مناہج

عام طور جب بھی تاریخ مرتب کی جاتی ہے، بنیادی طور پر اِن پانچ ذرائع سے مدد لی جاتی ہے۔ سوانح، ذاتی خطوط اور روزنامچے، ماضی کی معاصر حضرات کی تحریریں، سیاح اور مورخین کی تحریریں اور زبانی روایات۔ کسی بھی دور کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے یہ ذرائع بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جس سے مورخ ماضی کی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ مورخ کا کام محض انھیں من و عن نقل کرنا نہیں ہوتا بلکہ انتہائی محتاط انداز میں ان میں سے صرف حقائق کو ہی سامنے لانا ہوتا ہے کیونکہ ان ذرائع پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مورخ کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معاصر حضرات کی تحریریں، زبانی روایات اور سیاح و مورخین سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے کہ کتنا معروضی اور منصفانہ ہے؟ ان پر حسد، بغض، نسلی، مذہبی تعصب یا کوئی عوامل اثر انداز تو نہیں؟

ہندوؤں اور مسلمانوں کے علم تاریخ کی سب سے بڑی بد قسمتی ہے کہ ان کے تعامل کی غیر جانبدارانہ اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی ہے، اور اس موضوع پر جب بھی قلم اٹھایا گیا ہے جنگ و جدل کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ برصغیر کی تاریخ لکھنے والے مورخین میں سے بہت سے متعصب تھے جنھوں نے فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے اور برصغیر کی ان دو بڑی قوموں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے تاریخی حربے سے بخوبی کام لیا ہے۔ ان مورخین نے ہر سطح پر یہی

تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو ہندوؤں کے مندر توڑنے اور انھیں بالجبر مسلمان بنانے کے سوا کوئی کام نہ تھا اور ہندو بادشاہوں نے بھی ہمیشہ مسلمانوں سے بد عہدی کی ہے اور مسلمانوں سے برسرپیکار رہے ہیں۔ بہت سے متعصب مورخین نے اپنے سیاسی مخالفین کو بدنام کرنے کے لیے تاریخ کو داغدار کیا ہے۔ تاریخ فرشتہ اور تاریخ فیروز شاہی اس قسم کی تاریخ کی واضح مثال ہے جن پر کامل اعتماد رکھنا کسی بھی مورخ کے لیے ممکن نہیں۔ بالخصوص تاریخ فیروز شاہی کے مصنف مولانا ضیاء الدین برنی کا ہندو تعصب اور مورخین ہند کا فادر کہلانے والے جادوناتھ سرکار کا مسلمانوں، بالخصوص اورنگ زیب سے متعلق تعصب کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مزید برآں تاریخ کے مطالعے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں عام طور پر طلباء واہل علم سے جو غلطیاں ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

- بادشاہوں کے ذاتی افعال کو بھی مذہبی رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ ان کی سیاست اور مذہب کو الگ رکھ کر جائزہ لینا چاہیے۔ ہندوستان میں بادشاہوں نے کچھ کیا ان میں یقیناً بہت کچھ قابل مواخذہ ہے لیکن اسے مذہب کی طرف منسوب کرنا کسی بھی طرح درست نہیں۔
- مسلمانوں کے اکثر مذہبی رہنماؤں اور مورخین کی بڑی تعداد کی یہ غلطی رہی ہے کہ وہ ہندوستان میں حکومت کرنے والے ہر ایک بادشاہ کو عادل و منصف اور متقی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے دفاع میں وہ ان سلاطین کے غیر شرعی اعمال کا غیر معقول

-

جواز پیش کرنے لگتے ہیں۔

- دوسری طرف ہندوؤں کے اکثر مورخین نے بھی معدودے چند ایک کے علاوہ بیشتر ہندو مورخین نے بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر اور ٹیپو سلطان ہر ایک کو ایک ہی قطار میں شمار کر کے انھیں لٹیرا اور دولت کی ہوس رکھنے والے حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو سرزمین ہند میں گھس بیٹھیے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

ان نام نہاد مورخین نے تاریخ کے ساتھ جو کچھ بد دیانتی اور غلطیاں کی؛ انھیں بعد کے مورخین نے قابل اعتبار مان من و عن قبول کر لیا ہے ۔ ان مورخین کے مقلدین میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل رہے ہیں۔ اپنے ہم مذہبوں کو ہیرو بنانے کی غرض سے تاریخ سے جو کچھ کیا ہے ہمیں اس سے معافی مانگ کر تاریخ کا مطالعہ اپنے قومی تعصبات کے عینک اتار کر حقائق کی روشنی میں کرنے چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ ایسے مخلص اور دیانتدار مورخین سامنے آئیں جو اپنے تمام تر تعصبات کی عینک اُتار کر تاریخ کا مطالعہ ہر قسم کے نسلی، قومی و مذہبی تعصبات اور طرف داری کو الگ رکھ کر کریں۔ بالخصوص ایسی باتوں کو تاریخ کا درجہ نہ دیں جو فی الحقیقت تاریخ سے زیادہ افسانہ نگاری ہی کہلائے جانے کے مستحق ہے۔

باب 1: ہِند میں اسلام کا ابتدائی تعارف

قدیم عرب و ہند

عرب اور برِ صغیر کے مابین تعامل کی تاریخ انسانی تہذیب کے ابتدائی ادوار میں ہی مل جاتی ہے۔ حالیہ برسوں کی آثارِ قدیمہ کی دریافتوں نے اس قدیم تعلق کو محض روایات و اندازوں کے دائرے سے نکال کر ٹھوس مادی شہادت کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ ان دریافتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار برس پہلے، یعنی کانسی کے دور (Bronze Age) میں بھی سرزمینِ ہند اور خطۂ عرب و خلیج کے باشندے تجارت اور تہذیبی لین دین کے ذریعے ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت وادیِ سندھ (ہڑپہ) کی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور اسی تہذیب کے لوگ عرب و بین النہرین کی اقوام کے ساتھ سمندری راستوں سے تجارتی روابط قائم کیے ہوئے تھے۔

اس ضمن میں ایک نہایت اہم دریافت متحدہ عرب امارات کے مشرق میں، خلیجِ عمان کے ساحل پر واقع قدیم بستی "کالبا" (Kalba) سے ہوئی ہے۔ آسٹرین آرکیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کی کھدائیوں سے ثابت ہوا ہے کہ یہ بستی تقریباً ۲۵۰۰ قبل مسیح میں آباد ہوئی اور

-

صدیوں تک بین النہرین، ہند اور عرب کے درمیان تجارت کا ایک اہم مرکز رہی۔ یہاں ملنے والی ایک مہر (seal) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس میں ہندوستانی ہڑپہ تہذیب کی علامات مقامی عربی نقوش کے ساتھ یکجا نظر آتی ہیں۔[1] ماہرین کے مطابق یہ مہر اُس منظم تجارتی نظام اور انتظامی طریقِ کار کی گواہی دیتی ہے جو اُس دور میں ہند اور عرب کے مابین رائج تھا۔ یوں یہ آثاری شواہد اس حقیقت کو مزید مؤکد کر دیتے ہیں کہ عرب و ہند کا باہمی تعلق ہزارہا سال پرانا ہے، اور اسلام کی آمد کے بعد قائم ہونے والے روابط دراصل اسی قدیم اور مستحکم رشتے کا تسلسل تھے۔

وادیِ سندھ کی تہذیب کے زوال کے بعد بھی عرب و ہند کے یہ تجارتی و تہذیبی روابط منقطع نہیں ہوئے، بلکہ صدیوں تک مختلف صورتوں میں قائم رہے۔ قدیم جنوبی عرب کی مملکتیں سبا، حِمیَر اور حَضرَموت عالمی تجارت کا مرکز تھیں، اور اسی تجارتی شاہراہ سے ہندوستانی اجناس عرب کی منڈیوں سے ہوتے ہوئے دنیا کے دور دراز خطوں تک پہنچتی تھیں۔ ان اشیاء میں کالی مرچ، ادرک، دار چینی، سونٹھ، عود، صندل، کافور، مشک اور نیل جیسی چیزیں سرِ فہرست تھیں، جو عرب معاشرے میں اس قدر معروف ہوئیں کہ ان کے

[1] Christoph Schwall, Michael Brandl, Mario Börner, et al., "Kalba: research on trade networks of a prehistoric coastal community on the Gulf of Oman, United Arab Emirates," *Antiquity*, Vol. 98, Issue 399 (June 2024), e17. DOI: https://doi.org/10.15184/aqy.2024.45

-

ہندوستانی نام عربی زبان کا حصہ بن گئے۔

اہلِ لغت اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ عربی کے کئی الفاظ دراصل سنسکرت یا قدیم ہندوستانی زبانوں سے ماخوذ ہیں؛ مثلاً "زنجبیل" (ادرک، سنسکرت: شرنگویر)، "فلفل" (مرچ، سنسکرت: پپّلی)، "کافور" (سنسکرت: کپور)، "صندل" (سنسکرت: چندن)، اور "نارجیل" (ناریل، سنسکرت: ناریکیل)۔ یہ امر خاص طور پر لائقِ توجہ ہے کہ ان میں سے بعض اشیاء ہندوستان سے اس تسلسل کے ساتھ عرب پہنچتی رہیں کہ ان کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی آیا، چنانچہ سورۃ الدہر (الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے بیان میں "کافور" اور "زنجبیل" دونوں کا ذکر موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مصنوعات عربوں کے روزمرہ ذوق و ثقافت میں کس قدر رچ بس چکی تھیں۔

پہلی صدی عیسوی کے ایک یونانی بحری رہنما "پیریپلس آف دی ایریتھرین سی" (Periplus of the Erythraean Sea) میں بحیرۂ احمر، ساحلِ عرب اور ہندوستان کے درمیان موسمی ہواؤں (مون سون) کے ذریعے ہونے والی منظم بحری تجارت کا تفصیلی ذکر ملتا ہے، جس میں عرب کی بندرگاہِ عدن اور ہندوستان کے ساحلِ مالابار کے مابین آمد و رفت نمایاں ہے۔ اسی دور کی ایک تازہ آثاری شہادت متحدہ عرب امارات کے مقام "تل ابرق" (Tell Abraq) سے ملی ہے، جہاں ایک اطالوی تحقیقی مشن نے تقریباً دو ہزار

سال پرانی ایک عبادت گاہ دریافت کی ہے جو اُن تاجروں کی مذہبی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے جو خلیج اور بحرِ ہند کے تجارتی راستوں پر سفر کرتے تھے۔ اس موضوع پر برِ صغیر کے نامور محقق علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" میں نہایت گراں قدر اور بصیرت افروز تحقیق پیش کی ہے، جس میں انھوں نے قدیم زمانے سے عرب و ہند کے مابین تجارتی، لسانی اور تہذیبی روابط کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ الغرض، جب تک عرب میں اسلام کا سورج طلوع ہوا، اُس وقت تک عرب و ہند کے درمیان روابط کی ایک طویل اور مستحکم تاریخ موجود تھی؛ چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد جو تعلقات قائم ہوئے، وہ کوئی نئی چیز نہ تھے بلکہ اسی صدیوں پرانے رشتے کا تسلسل تھے، جن کا آغاز اب ہم عہدِ نبوی ﷺ سے کرتے ہیں۔

عہد نبوی ﷺ اور عہد خلافت

خطۂ عرب اور سرزمین ہند کا باہمی تعلق بہت پرانا ہے۔ قدیم دور سے ہی ان کے درمیان تجارتی روابط قائم رہے ہیں اور ہندوستانی اقوام بالخصوص جاٹ اور سیابجہ قوم کے کئی لوگ عرب کے مختلف علاقوں میں آباد بھی ہو چکے تھے۔ ان میں بعض ہندی نسل کے وہ لوگ وہ بھی تھے جو دراصل ایرانی فوج کے اہلکار تھے اور بعد ازاں یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بصرہ کے سرکاری خزانے کی نگرانی پر جو لوگ متعین وہ بھی

برصغیر کے جاٹ اور سیابجہ تھے جو قدیم زمانے سے یہاں آباد تھے اور بعد میں اسلام قبول چکے تھے۔ عرب اور ہند کے یہ قدیم تعلقات ظہورِ اسلام کے بعد بھی قائم رہے۔ بخاری و دیگر کتب میں کئی روایات ملتی ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندوستانی اشیاء سے علاج کی ہدایات دی ہیں، ان روایات سے معلوم ہوتا ہے عہد نبوی میں بھی عرب و ہند کے باہم تجارتی تعلقات موجود تھے۔ لیکن اس تجارتی لین دین کے ساتھ یقیناً ان کے باہم کچھ نہ کچھ تہذیبی روابط بھی تھے۔ حتیٰ کہ ایک ایک جینی مصنف لالہ سمیر چند جینی "پارس چرتر" نامی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں ملک عرب میں بہت سے بت پوجے جاتے تھے، مسلمانوں کے ہاں جو بہت سے بتوں کا ذکر ہے۔ جن کو عرب کے باشندے پوجتے تھے اس میں سے غالباً بہت سے بُت جینیوں کے تھے۔ جن کے وہ آدھے نام لیا کرتے تھے۔"[1]

مورخین بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (571-632CE) کی بعثت کا اہل ہند کو بخوبی علم تھا۔ کتب حدیث میں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ہندوستانی راجہ نے زنجبیل (ادرک) کو بطور تحفہ پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صحابہ میں تقسیم فرمایا۔[2]

---

[1] لالہ سمیر چند جینی۔ **پارس چرتر**۔ دیباچہ صفحہ 14۔ ہریانہ: آتمانند جین ٹریکٹ سوسائٹی، ہریانہ، بھارت

[2] حاکم۔ المستدرک علی الصحیحین۔ کتاب الاطعمہ۔ حدیث 7190۔ بحوالہ: امت مسلمہ کی دعوتی، علمی، فکری اور تہذیبی

جنوبی ہند کی مقامی روایات کے مطابق راجا چیرامان پیرومال نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی بادشاہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے عرب کا سفر بھی کیا لیکن راستے کہیں میں وفات پا گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ البتہ انھوں نے وقتِ وفات عرب مسلمانوں کو مالابار جا کر وہاں اسلام کی اشاعت کی درخواست تھی۔ چنانچہ تابعی مالک بن دینار (d. 745) اور مالک ابن حبیب ایک جماعت کے ہمراہ مالابار آئے اور یہاں مسجد بھی تعمیر کی۔ چیرامن کے اس واقعے کے بارے میں مورخین ہمیشہ ہی سے شکوک کا اظہار کرتے ہیں تاہم یہ بات قابل اعتماد ہے کہ یہاں کسی نو مسلم راجہ کی ہی درخواست پر مسلمانوں کی جماعت یہاں آئی، جبکہ بعض مورخین کے مطابق یہاں نویں صدی میں کسی راجہ نے اسلام قبول کیا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق جنوبی ہند سے ہی ہندوؤں کے جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرف سے دین اسلام کی تحقیق کے لیے ایک وفد بھی عرب بھیجا گیا تھا۔ مشہور جہاز راں اور سیاح بزرگ بن شہریار نے 900-953CE کے دوران سمندری سفر کیے اور اپنا سفر نامہ "عجائب الہند" لکھا، اسی کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

> سرندیپ [سری لنکا] اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے ایک سمجھدار آدمی کو مدینہ بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے

پاس جاکر آپ کے حالات اور آپ کی دینی دعوت کی تحقیق کرے، مگر اس آدمی کے سامنے کچھ مشکلات آگئیں اور وہ اس وقت مدینہ پہنچا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاچکے تھے، بلکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (c. 573–634CE) بھی وفات پاچکے تھے، اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت پر متمکن تھے۔ اس لیے آپ ہی سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور آپ نے اس سے شرح وبسط کے ساتھ تمام باتیں بیان کیں۔[1]

ہند میں بعض صحابہ کرام کی آمد کے بارے میں بھی بعض روایات ملتی ہیں لیکن محدثین کے نزدیک وہ غیر مستند ہیں اس لیے ان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ البتہ خلافت راشدہ کے دور میں پہلی صدی ہجری میں ہی عرب سے صحابہ کرام کے ہندوستان آنے کے متعلق کئی مستند روایات موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا ابتدائی قافلہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں وارد ہوا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دورِ خلافت میں بحرین اور اس کے اطراف سے فتنہ ارتداد نے سر اٹھایا ہوا تھا۔ اہل اسلام نے جب ان فتنہ انگیزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو ان علاقوں میں مقیم جاٹوں اور سیابجہ نے فتنہ انگیزوں کی حمایت میں مسلمانوں کے خلاف جنگ میں

[1] قاضی اطہر مبارک پوری۔ عرب وہند، عہد رسالت میں۔ صفحہ 144۔ لاہور: تخلیقات پبلشر۔ (2004)

حصہ لیا اور پھر وہاں سے فرار ہو کر اپنے اپنے قبیلوں اور علاقوں میں چلے گئے۔[1] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت چونکہ بہت مختصر تھا، اس لیے ان کے دور میں ہندوستان میں کسی قسم کی پیش قدمی نہ ہو سکی۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بحرین اور عمان کے گورنر حضرت عثمان الثقفی رضی اللہ عنہ نے ایک فوجی لشکر گجرات، سندھ اور مکران کے ساحلی علاقوں کی طرف بھیجا جس میں انھیں فتح حاصل ہوئی، لیکن خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کاروائی کی اطلاع ملی تو انھوں نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ ان غیر منظم بحری حملوں کے بعد عہدِ فاروقی میں پھر کسی مہم کا پتہ نہیں چلتا۔[2]

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں سندھ موجودہ زمانہ کے صوبہ سندھ سے زیادہ علاقے پر محیط تھا جس میں بحر عرب کے ساحلی علاقے مکران، کاٹھیاوار، گجرات، صوبہ پنجاب کا بیشتر حصہ، موجودہ پاکستان کے شمال مغرب اور مالوہ اور راجپوتہ بعض علاقے بھی اس میں شامل تھے۔ یہ سارہ علاقہ اس وقت سندھ کہلاتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے یعنی 644ء میں سندھ کے برہمن راجہ چچ (632-671CE) نے ایران کی حمایت میں مکران کی سرحد پر سندھی فوج نے پے در پے حملے شروع کر دیے تھے

[1] بلاذری، فتوح البلدان۔ صفحہ 368 ۔ بحوالہ: محمد اسحاق بھٹی، **برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش**۔ صفحہ 19۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔۔1990

[2] قاضی اطہر مبارک پوری۔ عرب وہند، عہد رسالت میں۔ صفحہ 144

-

جو اسلامی سلطنت کا حصہ تھا۔ دوسری طرف کابل و قندھار جو اس وقت خلافت اسلامیہ کے ماتحت تھے وہاں کے شکست خوردہ باغیوں کو راجہ چچ نے پناہ دے رکھی تھی۔ مسلم افواج نے مکران میں ان شورش پسندوں کی سرکوبی کرکے اپنا علاقہ واپس لیا لیکن یہ مہم صرف مکران تک محدود رہی۔ سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے ادوار میں بھی بہت سے مہمات مکران اور سندھ کے علاقوں میں بھیجی گئی جن کا مقصد قلات اور قرب و جوار کے بحری قزاقوں کا قلع قمع کرنا تھا۔

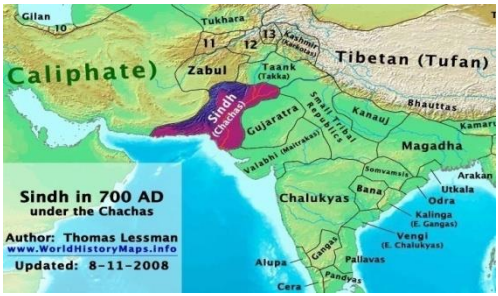

چچ اور مسلم سلطنت بشکریہ Wikipedia

ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان میں عرب صرف جنگی مہمات کے لیے ہی آئے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ عرب کے تاجر قدیم زمانے سے ہی یہاں آتے رہتے تھے۔ یہی صورت حال ظہورِ اسلام کے بعد بھی رہی، البتہ اب ہندوستان آنے کے محرکات میں ایک اہم محرک یہاں کے لوگوں کی مذہبی پستی کی فکرمندی بھی تھی۔ اسی ہمدردی اور فکر کے ساتھ صحابہ کرام اور تابعین خاصی تعداد میں

جنوبی ایشیائی علاقوں میں تشریف لائے۔

ہند میں صحابہ کی آمد

عہد نبوی سے خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بہت سے صحابہ کی ہندوستان آمد کا ذکر بابجا سماعی اور تحریری روایات میں ملتا ہے۔ بالخصوص جنوبی ہند میں میں کئی ایسی مساجد ہیں جن کی ابتدائی تاریخ عہد نبوی کی ہے۔ ان میں چیرامن مسجد (کیرالہ) اور پلائیا مسجد (کیلاکرائی) خاص طور پر شامل ہے جو عرب تاجروں نے بنائی۔ جنوبی ہند میں حضرت تمیم انصاری کے نام سے جو مزار ملتا ہے وہ بھی مستند نہیں ہے تاہم متصل مسجد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آمد ہوچکی تھی۔ اسی طرح گجرات کی گوگھا مسجد کی تاریخ بھی 624 یعنی عہد نبوی کی بتائی جاتی ہے۔ چولستان کے صحرا میں قلعہ دراوڑ کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا مزار ہے۔ یہاں چار قبریں نبی کریم ﷺ کے صحابہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ مقامی طور پر جو نام مشہور ہیں ان میں حضرت طاہر، حضرت جواد، حضرت جوّار اور حضرت طیب رضی اللہ عنہم کے نام لیے جاتے ہیں، اور ان کی قبروں پر ان کے حضور ﷺ کے ساتھ گزارے وقت کا ذکر بھی درج ہے، لیکن غور طلب بات ہے کہ یہ نام بالخصوص جواد اور جوار بالعموم اس زمانے میں معروف نہیں تھے۔

اندرون سندھ بھی بعض صحابہ کے مزارات ملتے ہیں، جن کے نام اگرچہ مشکوک ہے مگر گمان کیا جاسکتا ہے کہ اسی زمانے میں یہاں مسلمان آباد ہوچکے تھے۔ بعض صحابہ کی صرف آمد کا ذکر

-

مستند روایات میں ہے۔ مثلاً:

(۱) حَکَم بن ابی العاص (۲) حَکَمُ بن عمرو ثعلبی غفَاری (۳) حضرت خریت بن راشد ناجی سامی (۴) رُبَیِّعُ بن زیاد حارثی مَذحَجی (۵) سنان بن سلمہ ہذَلی (۶) حضرت سہل بن عدی خزرجی انصاری (۷) حضرت صحّار بن عباس عبدی (۸) حضرت عاصم بن عَمرو تمیمی (۹) عبد اللہ بن عبد اللہ بن عِتبان انصاری (۱۰) عبد اللہ بن عمیر اَشجعی (۱۱) عبد الرحمن بن سَمُرہ قرشی (۱۲) عبید اللہ بن معْمَر قرشی تیمی (۱۳) عثمان بن ابی العاص ثَقَفی (۱۴) حضرت عُمیر بن عثمان بن سعد (۱۵) مجاشع بن مسعود سَلَمی (۱۶) حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفی (۱۷) حضرت منذر بن جارود عبدی (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔

یہ سترہ اسماء صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ جس کو قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف "خلافت راشدہ اور ہندوستان" میں تحریر کیا ہے۔ جبکہ تابعین کی تعداد بے شمار ہے جو پورے ہند میں پھیلے ہوئے تھے۔

مؤرخ ایلیٹ اور ڈاؤسن اپنی کتاب *The History of India, as Told by Its Own Historians* میں کہتے ہیں کہ 630 عیسوی میں سب سے پہلا جہاز مسلمان مسافروں کا ہندوستانی ساحل پر دیکھا گیا تھا۔ ایچ جی راولنسن اپنی کتاب *Ancient and Medieval History of India* میں دعویٰ کرتے ہیں کہ سب سے پہلے عرب مسلمان ساتویں صدی کے

آخر میں ہندوستانی ساحل پر آباد ہوئے۔ اس حقیقت کی تصدیق جے اسٹورک نے اپنے *Madras District Manuals* میں اور ہریداس بھٹ اچاریا نے *Cultural Heritage of India Vol. IV* میں کی ہے۔ عرب سے ہند آنے والے اِن مسلمانوں میں زیادہ تر تاجر حضرات ہی تھے جن کے اخلاق اور دیانت داری سے متاثر ہو کر یہاں لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔ چند ہی دہائیوں میں یہاں مسلمانوں کی آبادی اس قدر ہو چکی تھی کہ یہاں درسِ حدیث کی مجالس کا آغاز ہو چکا تھا جس میں سینکڑوں طلباء ہوتے تھے۔ محمد بن قاسم کی مہم کے اسباب بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ ساتویں صدی میں ہی مسلمان کثیر تعداد میں ہند میں آباد ہو چکے تھے۔

محمد بن قاسم کا دور

راجہ چچ کے بعد ایک مختصر عرصے کے لیے راجہ چندر (c. 671-679) تخت پر بیٹھے جن کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی اچھا تھا اس لیے اس زمانے میں مسلمانوں نے سندھ کی جانب دوبارہ کوئی جنگی مہم نہ بھیجی۔ چندر کے انتقال کے بعد ان کا چھوٹا بھائی راجہ داہر تخت پر بیٹھا۔ دوسری جانب مسلم خلافت میں ایک جرنیل محمد بن قاسم اس زمانے میں نمایاں ہوا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم (695-715CE) کا دور ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے حوالے سے اہم ترین مانا جاتا ہے۔ اس دور سے قبل ہندوستانیوں کے اسلام سے شناسا ہونے کے باوجود نہ یہاں کوئی باقاعدہ مسلم سلطنت تھی اور نہ ہی یہاں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر سیاسی

رسوخ تھا۔ بلکہ چند سرحدی علاقوں تک مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تھا۔ پورے برصغیر میں اسلام کا اثر ورسوخ قائم کرنے کا سہرا محمد بن قسم کو جاتا ہے جس کے دور میں ہندوستان کا ایک حصہ مسلم حکومت کے زیر نگیں آ گیا تھا۔

علافیوں کی بغاوت اور راجہ داہر کی حمایت

عمان کے قبیلے بنوسامہ کے دو شخص محمد بن علافی اور معاویہ بن علافی جو کہ حقیقی بھائی تھے، مرکزی حکومت سے بغاوت کر کے مکران کے اس حصے پر قابض ہو گئے تھے جسے مسلمان کچھ عرصہ قبل فتح کر چکے تھے۔ انھوں نے یہاں کے عہدیدار سعید بن اسلم کلابی کو ایک قرابت دار کی جان لینے کے الزام میں قتل کر دیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ علافیوں کی اس بغاوت کا جواب دینے کے لیے حجاج بن یوسف (660-714) کی جانب سے مجاعہ بن سعید تمیمی اور محمد بن ہارون کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ محمد بن ہارون نے معاویہ بن علافی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا جبکہ اس کا بھائی محمد بن علافی اپنے سپاہیوں کے ہمراہ راجہ داہر کے پاس چلا گیا۔ علافی بردران کو راجہ داہر کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے راجہ نے نہ صرف انھیں پناہ دی بلکہ اپنی حمایت کا یقین بھی دلایا۔ حجاج نے راجہ داہر کو کئی بار پیغامات بھیجے کہ وہ ان باغیوں کی مدد نہ کرے مگر وہ اس سے باز نہ آیا۔

واضح رہے کہ اس زمانے میں لکھی جانے والی بیشتر مذہبی اور تاریخی کتابیں اس زمانے کو

-

ہندوستان کے زوال کا زمانہ قرار دیتی ہیں؛اس کے علاوہHenry Elliot نے بھی اپنی کتاب میں راجہ داہر سے متعلق زبانی داستانیں نقل کی ہیں جو گواہی دیتی ہیں کہ سندھ کے لوگ راجہ داہر سے خوش نہیں تھے۔

ہندی مسلمانوں پر حملہ

جس زمانے میں راجہ داہر خلافتِ اسلامیہ کے باغیوں کی حمایت کر رہا تھا، اسی زمانے میں جنوبی ہند میں انتہائی پر امن ماحول میں اسلام کی اشاعت جاری تھی۔ جنوبی ہند میں آنے والے مالک ابن حبیب اور ان کی اولادوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی تبلیغی خدمات کی بدولت جلد ہی یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی کمیونٹی وجود میں آگئی جس میں زیادہ تعداد میں نو مسلمین شامل تھے۔ ان نو مسلم اور ہندو راجاؤں کے تعلقات بھی خلافت اسلامیہ کے ساتھ بہت اچھے تھے اور عرب سے ان کے تجارتی تعلقات بھی تھے۔

یہاں ایک مسلم خاندان کے اجداد وفات پا چکے تھے۔ جنوبی ہند کے حکمران اور خلافت اسلامیہ کے باہم تعلقات چونکہ انتہائی خوش گوار تھے اسی لیے انھوں نے حسنِ سلوک کے خاطر ان عورتوں اور بچوں کو اپنی خاص کشتیوں کے ذریعے واپس عرب بھیجنے کا انتظام کیا اور ساتھ ہی بہت سے تحائف بھی بھیجے۔ آٹھ جہازوں پر مشتمل اس قافلے کو درباری لوگوں کی نگرانی میں روانہ کیا گیا تھا مگر راستے میں سندھ میں دیبل کے مقام پر سمندری قزاقوں نے ان پر حملہ کر دیا اور

انھیں اغوا کر لیا۔ مسلم گورنر حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے راجہ داہر کے پاس قاصد بھیج کر یہ پیغام پہنچایا کہ مسلمانوں کو ان کے مال و متاع سمیت آزاد کر دیا جائے۔ لیکن راجہ نے کسی بھی قسم کی کاروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ راجہ داہر کے عدم تعاون پر حجاج بن یوسف نے ڈاکوؤں کے خلاف از خود کارروائی کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک مہم دیبل بھیجی۔

راجہ داہر کی طرف سے قزاقوں کی مدد

دیبل بھیجی جانے والی اس اولین مہم کا مقصد صرف بحری قزاقوں کے خلاف کاروائی اور مسلمانوں کو بازیاب کرانا تھا۔ مگر یہ مہم قزاقوں کو حاصل بیرونی حمایت کے سبب ناکام رہی۔ اسی کے فوراًبعد حجاج نے ایک اور مہم سندھ بھیجی لیکن اب کی بار راجہ داہر نے اپنے بیٹے جے سنگھ کی قیادت میں چار ہزار کا لشکر ڈاکوؤں کی مدد کے لیے بھیج دیا، جس کے نتیجے میں مسلم فوج کا خاصا جانی نقصان ہوا اور یہ دوسری مہم بھی بے نتیجہ رہی۔ یہ حرکت راجہ داہر کی طرف سے واضح طور پر اعلان جنگ تھا۔ قزاقوں کی اس واضح حمایت کی ہی وجہ سے مورخین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کو سمندری قزاقوں نے راجہ داہر کی سرپرستی میں ہی اغوا کیا تھا۔

سندھ کی فتح

راجہ داہر چونکہ خلافتِ اسلامیہ کے خلاف اپنے بغض کا اظہار پہلے ہی کر چکا تھا اس لیے اب حجاج نے شرح وبسط کے ساتھ اس کے خلاف کاروائی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے قابل جنرل محمد بن قاسم کی

سرکردگی میں مظلوم ہندی مسلمانوں کی مدد کے لیے فوج بھیجی۔[1] چنانچہ محمد بن قاسم مکران فتح کرتے ہوئے اور سندھ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ قزاقوں کی معاونت کرنے والوں کو پکڑا جاسکے۔ مگر دیبل میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ اپنی ہزاروں فوج کے ساتھ موجود تھا۔ دیبل کے مقام پر دونوں افواج آمنے سامنے ہوئی جس میں مسلمان فوج کی برتری رہی اور جے سنگھ کو بری طرح شکست ہوئی۔ ہماری تحقیق کے مطابق دیبل کراچی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وہی مقام ہے جسے آج بھنبور کہا جاتا ہے۔

دیبل سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے یہاں ایک پنڈت کو ناظم شہر مقرر کرکے سیستان یعنی موجودہ شہر سہوَن کا رخ کیا۔ راستے میں محمد بن قاسم نیرون کوٹ (موجودہ حیدرآباد) سے گزرے تو یہاں کے راجہ اور باشندوں نے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا اور محمد بن قاسم بھی ان کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ یہاں کے راجہ نے پہلے ہی حجاج سے ایک سفیر کے ذریعے امان طلب کرلی تھی۔ حجاج نے بھی انھیں امان لکھ کر یقین دلایا تھا کہ مسلم فوج ان غیر جانب دار لوگوں سے کوئی جنگ نہیں کرے گی۔ اسی طرح راستے میں آنے والے کئی چھوٹے شہروں نے صلح وامان کی درخواست کی جو قبول کرلی گئی۔

[1] مشہور ہے کہ جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی، یہ بات درست نہیں ہے۔ مختلف تاریخی کتب میں ان کی فتوحات اور تاریخ پیدائش کو دیکھا جائے اس حساب سے ان کی عمر کم از کم بھی 21 برس یا بعض مورخین کے مطابق 27 برس ہونی چاہیے۔ قتیبہ (عیون الاخبار)، یاقوت حموی (معجم البلدان) اور بلاذری جیسے قدیم مصادر کے قرائن یہی ثابت کرتے ہیں۔

سہون میں راجہ داہر کا بھتیجہ وجے رائے اگرچہ مسلم فوج سے لڑنے کے لیے تیار تھا لیکن یہاں کے مقامی لوگ لڑنے کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ایک مختصر سی جنگ کے بعد وجے رائے فرار ہو گیا اور یہاں کے غیر مسلم باشندے جو پہلے ہی مسلمانوں سے صلح کے حق میں تھے، انھوں نے محمد بن قاسم کا پرتپاک استقبال کیا اور راجہ داہر کی سرکوبی کے لیے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

شمال میں تمام اہم مقامات سے ہوتے ہوئے محمد بن قاسم راجہ داہر کی شورش پسندی کا جواب دینے کے لیے جنوب کی جانب بڑھا۔ یہاں انھوں نے موکو بن وسایو کو امان دی اور اس کی خوب مدارت کی اور جواب میں موکو نے بھی آخر تک محمد بن قاسم کے ساتھ تعاون کیا۔ اس کے بعد دریائے سندھ کے پار کر کے محمد بن قاسم نے اروڑ (روہڑی کے قریب) ایک گھمسان جنگ میں راجہ داہر کو قتل کر دیا۔ راجہ داہر کے قتل ہوتے ہی بہت سے مقامی ہندوؤں نے اطاعت قبول کر لی اور بعد ازاں مشرف با اسلام ہوئے۔ جبکہ راج داہر کی ایک بیوی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ستی ہو گئی اور باقی ساتھی محمد علافی اور راجہ کا بیٹا جے سینہ برہمن آباد فرار ہو گئے جو موجودہ شہداد پور سے 13 کلومیٹر دور جنوب مشرق میں واقع ہے۔ محمد بن قاسم نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے برہمن آباد اور ملتان تک سبھی علاقے فتح کیے۔ ان میں سے اکثر علاقوں کے باشندوں نے خود ہی محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کی۔ مگر جے سینہ فرار ہو چکا تھا اور بعد میں کشمیر کے کسی راجہ بلھر کے پاس رہنے لگا۔

-

محمد بن قاسم اور ہنود

ہندوستان کے مقامی باشندوں کے ساتھ محمد بن قاسم کا سلوک انتہائی احسن اور ہمدردانہ تھا۔ ان لوگوں کو اس مسلم فاتح پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی فوج میں بھی شامل ہو گئے تھے۔ سندھ کی مہم کے دوران دیبل اور کیرج کے مقامات پر صرف لڑنے والوں کو قتل کر دیا گیا، اور بے ضرر عوام کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی گئی۔ خصوصاً دست کاروں اور تاجروں وغیرہ کو امان دے کر اپنے مقام پر رکھا گیا۔ دس ہزار ایسے لوگوں کی مالی امداد فراہم کی گئی جنھیں جنگ کے دوران مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ محمد بن قاسم کی سب سے بڑی خوبی ہی یہی تھی کہ اس کی مذہبی پالیسی بھی رواداری پر مبنی تھی۔ انھوں نے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں مکمل طور پر مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ راوڑ قلعے کی فتح کے بعد انھوں نے مجمع عام سے جو خطاب کیا اس ایک جملہ یوں تھا:

> ہماری حکومت میں ہر شخص مذہبی معاملہ میں آزاد ہو گا جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔[1]

نہ صرف یہ کہ انھوں نے ہندوؤں کو مذہبی آزادی دی بلکہ فتح سندھ کے بعد برہمنوں کو بلا کر حکم دیا کہ اپنے مندر حکومتی خرچے پر مرمت کرالیں اور ملک کے آمدنی میں جو تین فیصد حصہ ہمیشہ

[1] مفتی شوکت علی فہمی۔ **ہندوستان پر اسلامی حکومت**۔ صفحہ 44۔ سٹی بک پوائنٹ، کراچی (2005)

سے مندروں کو ملتا آیا ہے بدستور ملتا رہے گا۔ ان کے دور کسی بھی مندر کو مذہبی جبر کی بنیاد پر نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ معروف ہندو مورخ رماشنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

سندھ میں فاتحین نے رواداری کی دور اندیشانہ پالیسی پر عمل کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام پھیلا لیکن "عیسائیوں کے مندروں، یہودیوں کے عبادت خانوں اور آتش پرستوں کی قربان گاہوں کی طرح ہندو مندر بھی محفوظ و مستحکم رہے۔" برہمنوں کو بھی یہ اجازت تھی کہ وہ چاہیں نئے مندر تعمیر کریں چاہیں پرانے مندروں کی مرمت کرائیں۔[1]

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ سندھ اور پنجاب کے وہ علاقے جہاں بدھ مذہب کے پیروکار اکثریت میں تھے، وہاں محمد بن قاسم کو بدھ راہبوں کی بھرپور حمایت حاصل رہی۔ سندھ کے شمالی اور اندرون علاقے جنہیں آج کل سہون، سکھر، لاڑکانہ یا شہداد پور کہا جاتا ہے، اس زمانے میں یہاں بدھ مت اکثریتی مذہب تھا۔ یہ علاقے راجہ داہر کے ہی تابع تھے مگر یہاں مقامی راجہ یا ٹھاکر بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ حکمران راجہ داہر کی بھاری ٹیکس اور مذہبی پالیسیوں سے خوش نہ تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں بدھ مت پر کافی مذہبی جبر ہو رہا تھا۔ اور جواباً محمد بن قاسم نے بھی انتہائی حسن سلوک کیا اور ان کی عزت افزائی کی۔ محمد بن قاسم کے حسن سلوک سے بہت سوں نے نہ صرف خود اسلام قبول کر لیا بلکہ اس کی فوج اور بے شمار مقامی جاٹ لوگوں بھی بخوشی مسلمان ہو گئے۔

[1] Rama Shankar Tripathi, ***History of Ancient India.*** (Delhi: Motilal Banarsidas Publisher, First Edition 1942), P. 338

ہر ایک جگہ فتح سے سرفراز ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے برہمنوں کو ان کے طریقے کے مطابق شان و شوکت سے زیورات عطا کیے اور ہر ایک کو موزوں ذمہ داریاں بھی عطا کیں۔ اس بارے میں واضح مثال برہمن آباد کے مشہور قدیم مندر کے پجاریوں کی محمد بن قاسم کی خدمت میں پیش کردہ درخواست اور اس کے جواب میں ملتی ہے۔ فتح کے بعد اس قصبہ میں مسلمانوں کی آمد سے بہت سے ہندو خوف زدہ ہوئے اور انھوں نے مندر آنا جانا بند کر دیا۔ مندر کے پجاری جن کا ذریعہ معاش ہی مندروں کی خیرات اونذر و نیاز تھا، بہت پریشان ہوئے۔ ان پجاریوں نے محمد بن قاسم کی رحم دلی اور وسعت نظری کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا چنانچہ انھوں محمد بن قاسم کی خدمت میں اپنی درخواست بھیجی کہ اس مندر کی آبادکاری کے لیے ضروری قدم اٹھایا جائے اور لوگوں کا خوف دور کیا جائے تاکہ وہ دوبارہ مندر آسکیں۔ محمد بن قاسم نے یہ اعلان کیا کہ ہر شخص بلا خوف و خطر مندر جاسکتا ہے اور اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکتا ہے۔[1] راجہ داہر کی موت کے بعد شہر میں ہر خاص و عام محمد بن قسم کے عدل، وفاداری، پرہیز گاری اور صدق گوئی کی گواہی دے رہا تھا۔[2]

ہندوستان کے متعلق حجاج بن یوسف کی بھی پالیسی مذہبی رواداری پر مبنی تھی۔ حجاج اپنے اس

[1] **فتح نامہ سندھ، عرف چچ نامہ۔** مصحح: نبی بخش خان بلوچ، مترجم: اختر رضوی۔ جامشورو: سندھ ادبی بورڈ۔ صفحہ 213-214

[2] ایضاً۔ صفحہ 224

جرنیل کو لکھے گئے بیشتر خطوط میں رواداری اور مذہبی آزادی کی نصیحتیں کیا کرتا تھا جس پر محمد بن قاسم بھی پابند رہے۔

محمد بن قاسم کے اسی احسن رویے کی وجہ سے ہندوؤں کے دلوں میں ان کی عظمت راسخ تھی۔ دیبل شہر کے انتظامی معاملات کے لیے محمد بن قاسم نے ایک پنڈت کو ہی حاکم مقرر کیا تھا۔ اس پنڈت نے بعد ازاں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح اروڑ کی فتح کے بعد راجہ داہر کا چچا زاد بھائی ککسو کو بھی محمد بن قاسم ن وزارت اور مشیر اعلیٰ کا عہدہ دیا۔[1] بدھیہ کے حاکم کاکا نے بھی محمد بن قاسم کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر نہ صرف خود اسلام قبول کیا بلکہ بے شمار جاٹ بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق راجہ داہر کی دوسری رانی لادی جو محمد بن قاسم سے آخر تک مقابلہ کرتی رہی بالا آخر اسلام قبول کر کے محمد بن قاسم سے ہی نکاح کر لیا۔[2]

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کے ہندو باشندوں کے ساتھ مذہبی، سماجی و معاشی تمام معاملات میں انتہائی عادلانہ برتاؤ کیا اور ہر جائز طریقے سے انھیں خوش رکھنے کی کوشش کی۔ خود سندھ کے لوگ محمد بن قاسم کو ایک امیر کی حیثیت سے تسلیم کر چکے تھے۔ ان کے عدل و انصاف اور طرزِ حکمرانی سے ہر شخص مطمئن تھا۔ ہندوؤں سے ان کے احسن سلوک کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انہیں سلیمان بن عبد الملک

[1] ایضاً۔ صفحہ 234

[2] صفحہ 223

نے سندھ کی گورنری سے ہٹایا تو اہل ہندوستان ان کے لیے بہت روئے اور کیرج شہر میں لوگوں نے ان کا بت (مجسمہ) بنا دیا۔[1] کیرج موجودہ زمانے میں راجھستان اور سندھ کا سرحدی علاقہ ہے جو جے پور تک جاتا ہے۔

اشاعت اسلام

محمد بن قاسم اور ان کے اہل کاروں نے سندھ میں سکونت اختیار کرتے ہی بہت سی مساجد اور مدارس یہاں قائم کیے۔ ان کے ساتھ آنے والے بہت سے اور تابعین نے بھی قرآن و حدیث کی تعلیم کے حلقے قائم کیے۔ ان میں ابو شیبہ جوہری، حاتم بن قبیصہ، راشد بن عمرو الازدی، زائدہ بن عمیر الطائی، زیاد بن حواری عمی، حکم بن عوانہ کلبی، معاویہ بن قرۃ، ابو موسیٰ السیلانی، یزید بن ابو کبیشہ الشامی، اور موسی بن یعقوب ثقفی نمایاں تھے۔ ان آخری صاحب کو محمد بن قاسم نے اروڑ شہر کا خطیب مقرر کر دیا تھا جو اس وقت سندھ کا دار الحکومت تھا اور اس کے آثار اب بھی روہڑی کے قریب موجود ہیں۔ ان کا خاندان ساتویں صدی ہجری (1300CE) تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔[2] سندھ سے آگے گجرات اور کاٹھیاوار میں بھی عبد الرحمٰن بن ابو زید بیلمانی کے دروسِ حدیث کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بعض ایسے تابعین کا ذکر بھی ملتا ہے جو اصلاً سندھ ہی سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے اسلام قبول کر کے اپنے علاقوں میں دعوت و

[1] بلاذری، فتوح البلدان 428 بحوالہ: محمد اسحاق بھٹی، **برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش**۔ صفحہ 170

[2] بھٹی۔ 95-113

تبلیغ کا کام کیا۔

اسی دور میں سندھ میں موجودہ شہداد کوٹ کے قریب منصورہ کا شہر آباد کیا گیا جو مسلم تہذیب کا مرکز بنا۔ لیکن بعد ازاں ان علاقوں کو اسماعیلی شیعوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا اور یہاں کی بڑی آبادی ان کے مذہب میں داخل ہوئی۔ جب عباسی خلافت کمزور پڑی تو ان دونوں شہروں میں اسماعیلی شیعوں کی حکومتیں بنیں جو محمود غزنوی (d. 422/1030) کے ہاتھوں ختم ہوئیں۔ ان اسماعیلی میں سے اکثریت نے یا تو سنی مسلک اختیار کر لیا یا پھر اثنا عشری شیعہ آبادی میں ضم ہو گئے۔

720ء میں جب یزید بن عبد الملک (r. 720-724) تخت پر بیٹھا تو اس نے سندھ میں ایک نہایت ہی متشدد گورنر جنید بن عبد الرحمٰن کو گورنر مقرر کیا۔ جنید نے سندھ کا اختیار حاصل کرتے ہی یہاں کے راجاؤں سے جنگیں شروع کر دیں۔ ان میں راجہ داہر کا بیٹا جے سینہ اور اس کا بھائی بھی شامل تھا جسے جنید نے قتل کر دیا۔ یہاں کے راجاؤں سے غیر ضروری جنگ اور ان کا قتل ایسا فعل تھا جس کی وجہ سے سندھ کے ہندوؤں میں مسلمانوں سے دوری پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

بھنبور میں واقع مسجد کے آثار

خلافت عباسیہ میں ہنود

بنو امیہ کے بعد قائم ہونے والی مسلمانوں کی دوسری عظیم سلطنت خلافت عباسیہ تھی جو750CE میں قائم ہوئی۔ اس سلطنت کا دور مسلم تاریخ میں خوشحالی اور علم و فن کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ اس سلطنت کا سب سے اہم کارنامہ بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارے کا قیام تھا جس میں یونانی، سریانی، فارسی اور سنسکرت سے عربی میں بہت بڑی تعداد میں فلسفہ، طب، ہیت، فلکیات، ریاضی، کیمیاء اور دیگر کئی علوم و فنون پر مشتمل بے شمار کتابوں کے ترجمے کروائے گئے تھے۔ اسی علمی تحریک میں مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کے علمی سرمائے سے بھی بھرپور استفادہ

کیا۔ خلافت عباسیہ میں ہندوستان کے بہت ہندو علما کو عباسی دربار میں اپنے علوم و فنون پیش کرنے کا موقع ملا اور انھیں دربار میں عزت و اکرام بخشا گیا۔ مشہور مورخ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

عربوں میں دوسری زبانوں سے علمی کتابوں کے ترجمہ کرانے کا خیال پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہو چکا تھا مگر چونکہ ابن تک حکومت کا مرکز شام تھا، اس لیے یونانی و سریانی زبانوں کا غلبہ رہا۔ لیکن جب عراق میں عباسی خلافت کا تخت بچھا تو ہندوستان اور ایران کی زبانوں کو بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ جب منصور کی علم دوستی کا چرچا پھیلا تو سن 154/771 میں سندھ کے ایک وفد (ڈیپوٹیشن) کے ساتھ ہیئت اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت سنسکرت کی سدھانت لے کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے حکم سے دربار کے ایک ریاضی دان ابراہیم فرازی کی مدد سے اس نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ عربوں کو ہندوستان کی قابلیت اور دماغ داری کا اندازہ ہوا۔ پھر ہارون نے اپنے علاج کے لیے یہاں سے وید [آیورویدکے ماہر طب] بلوائے جنھوں نے عربوں میں ہندوستان کی علمی عظمت اور بڑائی کی دھاک بٹھادی۔ اس کے بعد برامکہ کی سرپرستی میں طب، نجوم، ہیئت اور ادب و اخلاق کی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے عربی میں ہوا۔۔۔

الغرض خلیفہ منصور اور ہارون الرشید کی سرپرستیوں اور برامکہ کی قدر دانیوں اور فیاضیوں کی بدولت ہندوستان کے بیسیوں پنڈت اور وید بغداد پہنچے اور سلطنت کے طبی اور علمی محکموں میں مصروف ہوئے اور حساب، نجوم، ہیئت، طب اور ادب و اخلاق کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔۔۔ عربوں کی تحریروں میں ہندوستان کے جن پنڈتوں اور ویدوں کے نام آئے ہیں، وہ یہ ہیں: بہلہ، منکا، بازیگر (بجے کر؟) فلبرفل (کلپ رائے کل؟)، سندباد۔ یہ نام جاحظ (d. 255/869) نے لیے ہیں اور

اتنے نام لکھ کر اوروں کے نام فلاں فلاں کہہ کر چھوڑ دیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کو یحیی بن خالد برمکی نے ہندوستان سے بغداد بلوایا تھا۔ یہ سب طبیب اور وید تھے۔۔۔۔

ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تاریخ الاطبا میں لکھا ہے کہ یہ [ایک ہندی طبیب منکہ] طب اور علاج میں بہت ماہر تھا۔ ایک دفعہ ہارون الرشید سخت بیمار پڑا۔ بغداد کے تمام اطبا اس کے علاج سے عاجز آ گئے تو ایک شخص نے ہندوستان کے اس طبیب کا ذکر کیا۔ چنانچہ سفر خرچ بھیج کر وہ بلوایا گیا۔ اس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوئی۔ خلیفہ نے اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ پھر یہ دار الترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمہ پر مقرر ہوا۔ (تاریخ الاطبا 2/33)۔۔۔[1]

سنسکرت سے عربی میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان کی تعداد اگرچہ دیگر زبانوں کی نسبت قلیل ہے لیکن یہ مختلف موضوعات پر مشتمل تھی ان میں حساب، نجوم، طب، ہیئت، اخلاقی افسانے اور کہانیاں، سیاست اور کھیل اور تماشے وغیرہ شامل ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب وہند کے تعلقات" میں ایسی کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

زیر بحث دور میں ہندوستان میں مسلمان

ساتویں سے نویں صدی تک اس پورے عرصے میں مسلمان سندھ کے ساحلی علاقوں کے علاوہ کاٹھیاوار، گجرات، کن میں بڑی آبادی جبکہ شمالی ہند میں چھوٹی چھوٹی کمیونٹی کی صورت میں آباد

[1] سید سلیمان ندوی۔ **عرب وہند کے تعلقات**۔ صفحہ 77-74۔ لاہور: مشعل بکس

ہو چکے تھے۔ مشہور عرب سیاح مسعودی کے بیان کے مطابق مہاراشٹر کے شہر چول میں دس ہزار مسلمان آباد تھے۔[1]

جنوب مغربی سواحل پر بھی عرب تاجروں کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کی ایک قابل لحاظ تعداد آباد ہو چکی تھی۔ کولم (Kavalam) میں ایک قبرستان میں علی بن عثمان کی قبر پر 166ھ یعنی 783CE کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں ہی یہاں مسلمان آباد ہو گئے تھے۔[2] بنیادی طور پر یہ تاجروں کی حیثیت سے یہاں آباد ہوئے تھے مگر جلد ہی انھوں نے اچھے عہدوں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ باوجود یہ کہ ان لوگوں نے کثرت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا، انھیں کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کئی مسلم سیاحوں نے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی ایک قابل ذکر آبادی کا تذکرہ کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مسلمان یہاں آزادی کے ساتھ رہتے تھے اور انھیں عزت سے موپلا (Moppila) کہا جاتا تھا۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ کیرالہ کے راجا نے یہ حکم جاری کیا کہ ان کے علاقے میں ہر خاندان کے ایک بچے کی پرورش بطور مسلمان کی جائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ

---

[1] Dr Tara Chand, ***Influence of Islam in Indian Culture,*** (Allahabad: Indian Press Limited) P.36

[2] Innes. Malabar and Anjengo District Gazatteer. P.436....

بحوالہ: ڈاکٹر تارا چند۔ مقدمہ، **تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات** ۔ مترجم: ڈاکٹر مسعود احمد۔ صفحہ 59 ۔ مجلس ترقیٔ ادب۔ لاہور۔1964

-

اس دور میں ہندوؤں کے ہاں سمندر کے سفر کو مذہباً ممنوع سمجھا جاتا تھا جبکہ راجا اپنے ہاں سمندری سفر کے ذریعے تجارت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ تامل ناڈو کے چولہ خاندان کے بعض راجاؤں نے مسلمانوں کو ان کی جنگی مہارت کے پیش نظر اپنی افواج میں اہم عہدے دیے تا کہ وہ اس وقت کے لحاظ سے ان کی افواج کو اپ ٹو ڈیٹ کر سکیں۔ ہندوستان کے پورے مغربی ساحل پر جابجا مسلمانوں کے تجارتی دفاتر اور گودام قائم ہو گئے جنہیں نہ صرف تجارت بلکہ اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت بھی تھی۔

سندھ میں اس وقت بھی مسلمانوں کی آمد جاری تھی جن کا مقصد تجارت اور خاص طور پر اسلام کی تبلیغ تھا۔ سیاح بزرگ بن شہریار نے (900-953CE) عجائب الہند میں لکھتے ہیں کہ کشمیر کے راجہ مہروک (883CE) میں سندھ کے حاکم امیر عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز کو لکھا کہ میرے پاس ایک آدمی بھیج دیا جائے جو اسلامی شریعت کے احکام مقامی زبان میں بیان کر سکے۔ امیر عبد اللہ نے ایک مسلمان عالم کو بھیجا جو ہندوستان کی مختلف زبانیں جانتا تھا۔ اس نے راجہ کے پاس چند سال ٹھہر کر راجہ کو دین اسلام کی تعلیم دی۔ نیز راجہ کی خواہش پر مقامی زبان میں قرآن کا ترجمہ و تفسیر بھی لکھی جو نصف سے زائد مکمل ہو چکی تھی۔ مفسر نے جب ایک آیت کی تفسیر پڑھ کر سنائی تو وہ زمین پر سجدہ ریز ہو گیا اور زار و قطار رونے لگا، حتیٰ کہ سارہ چہرہ خاک آلودہ ہو گیا؛ سر

اٹھایا تو توحیدِ الٰہی کا اعلان کر رہا تھا۔[1]

یہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ اور تفسیر تھی جو شاید کشمیری زبان میں لکھی گئی۔ زیر نظر دور میں مشہور محدث ربیع بن صبیح السندی البصری بھی تھے جو بغرض اشاعت اسلام سندھ تشریف لائے اور مستقل یہیں سکونت اختیار کی۔ ان کا مزار کراچی سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

سندھ کی خلافتِ اسلامیہ سے علیحدگی

گزشتہ اوراق میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ عرب مسلمانوں نے سندھ پر کن محرکات کے پیش نظر حملے کیے تھے۔ محمد بن قاسم کے بعد سندھ میں بے شمار لوگ اسلام قبول کر چکے تھے۔ خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد سندھ کی حکومت چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہوئی۔ چونکہ اس دور میں خلافتِ اسلامیہ اندرونی طور پر ہی کافی کمزور تھی اس لیے کسی عرب حکمراں نے بھی اس طرف توجہ نہ دی۔ لیکن دسویں صدی کے بعد ترک نسل کے افغانیوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی جس میں سے پہلے ناصر الدین سبکتگین تھے۔

[1] ڈاکٹر مسعود احمد۔ مقدمہ، **تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات از ڈاکٹر تاراچند**۔ مترجم: ڈاکٹر مسعود احمد۔ صفحہ 20۔ مجلس ترقیٔ ادب۔ لاہور۔ 1964

باب2: محمود غزنوی کا زمانہ، مقدمات

تاریخ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ مختلف ادوار میں مختلف معانی اختیار کر لیتا ہے۔ اصل واقعہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے، لیکن بعد کی نسلیں اپنے سیاسی، مذہبی یا قومی تناظر کے مطابق اس کی نئی تعبیرات تشکیل دیتی ہیں۔

سومناتھ پر محمود غزنوی کے 1026ء کے حملے کے بارے میں بھی یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ معاصر اور بعد کے مختلف مآخذ اس واقعے کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں، جبکہ نو آبادیاتی دور (یعنی انگریزوں کی آمد کے بعد) اس کی ایک مخصوص تعبیر سامنے آئی جس نے بعد کی سیاست اور اجتماعی حافظے پر گہرا اثر ڈالا۔

یہاں ایک اور بڑی غلطی جو عصرِ حاضر کے اکثر مورخین انگریز مورخین کی طرح کرتے ہیں، وہ جدید زمانے کے تصورات کی روشنی میں قدیم زمانے کی تاریخ کو سمجھنا ہے۔ اکثر مورخین کی یہ غلطی رہی ہے کہ وہ گیارہویں اور بارہویں صدی کے ہندوستان کو اکیسویں صدی کے مذہبی تصورات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کا لازماً غلط نتیجہ ہی نکلے گا کیونکہ اس زمانے کی سیاست، سلطنت، مذہب اور ریاست کے باہمی تعلقات موجودہ دنیا سے بالکل مختلف تھے۔ اس بارے میں ہم مندروں کی تباہی کے ذیل میں مزید بات کریں گے۔

-

ہندو مسلم تصادم کا بیانیہ

محمود غزنوی اور اس کی بت شکنی پر بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ بنیادی حقیقت واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ محمود کے 1026CE کے حملے کو ایک "پوری ہندو قوم کے اجتماعی صدمے" اور دو تہذیبوں کے تصادم کے آغاز کے طور پر پیش کرنا دراصل نو آبادیاتی دور (Post Colonial Era) کی پیداوار ہے۔ اگر آپ انگریزی سے پہلے لکھی گئی ہندوستانی تاریخ دیکھیں تو اس واقعے کو ہندو مسلم تنازع کے طور پر پیش کرنے کا بیانیہ ہندوستان میں پہلے موجود نہیں تھا، بلکہ 1843 میں برطانوی (House of Commons) میں گھڑا گیا، اور جیمز مِل کی ہندوستانی تاریخ کی "ہندو دور / مسلم دور" میں تقسیم کے ذریعے فروغ پایا۔

ان انگریز مؤرخین نے تاریخ لکھتے ہوئے زیادہ تر انحصار ترک اور فارسی زبان میں لکھی ہوئی درباری تاریخوں پر کیا، جو محمود کی تعریف و تفاخر کے لیے لکھی گئی تھیں، اور دیگر ذرائع مثلاً مقامی سنسکرت کتبات، جین سوانح، تاجروں کے ریکارڈ اور مقامی روایات و یکسر نظر انداز کر دیا ہے جس کی وجہ سے تاریخ کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آ سکی۔

یہاں تک کہ خود ترک اور فارسی مآخذ بنیادی تفصیلات پر بھی متفق نہیں ہیں، حتیٰ کہ اس پر بھی کہ توڑا گیا بھی گیا ہے کہ نہیں۔ یا جو کچھ توڑا گیا وہ بت تھا یا کچھ اور۔ کیا وہ عرب کی دیوی "منات" (سُومنات) تھی، یا "لات"، یا شیو لِنگ؟ بعض شعرا (مثلاً فرخی سیستانی) نے اسے عربی بت "منات" سے جوڑا تاکہ حملے کو ایک خاص اسلامی بت شکنی کا رنگ دے کر محمود کی شان بڑھائی جا

سکے۔

ہندوستان کی معروف مورخہ رومیلا تھاپر (Romila Thapar) نے ایک تحقیقی کتاب سومنات کے عنوان سے لکھی ہے اور اس میں اس موضوع پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

مندروں کی تباہی

قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مندر صرف عبادت گاہ نہیں تھے۔ بلکہ وہ ریاست کی دولت، شاہی اقتدار، زمینوں کی ملکیت، علمی مراکز اور سیاسی اقتدار کی علامت بھی تھے۔ بڑے مندروں کے پاس ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی، سیکڑوں ملازمین، خزانے، زیورات اور شاہی عطیات موجود ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دو ریاستیں آپس میں برسرِپیکار ہوتیں تو مخالف ریاست کا قلعہ، شاہی خزانہ اور مرکزی مندر تینوں یکساں اہمیت رکھتے تھے۔ کسی مندر پر قبضہ کرنا یا اس کے مرکزی دیوتا کا مجسمہ بطورِ غنیمت لے جانا مذہبی اقدام نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اسے فاتح بادشاہ کی سیاسی برتری کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

اس حقیقت کی شہادت صرف مسلم یا فارسی مؤرخ ہی نہیں دیتے بلکہ سنسکرت کے کتبے، تانبے کے فرامین اور ہندو عصرِ حاضر کے مؤرخین بھی دیتے ہیں۔ امریکی مؤرخ رچرڈ ایٹن (Richard M. Eaton) نے اپنی مشہور تحقیق *Temple Desecration and Indo-Muslim States* میں تقریباً اسی نکتے پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک ابتدائی قرونِ وسطیٰ میں مندر ریاستی اقتدار کی

علامت تھے، اس لیے ان پر حملوں کو صرف مذہبی تعصب کی عینک سے دیکھنا تاریخی حقیقت کو سادہ بنا دینا ہے۔ ایٹن نے متعدد سنسکرت کتبوں، جنوبی ہندوستان کے فرامین اور فارسی تواریخ کا تقابلی مطالعہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ مخالف ریاست کے شاہی مندر کو نشانہ بنانا ایک معروف سیاسی روایت تھی، جسے مختلف خاندانوں نے مختلف ادوار میں اختیار کیا۔

اس ضمن میں سب سے پہلی اہم مثال چولا سلطنت کی ہے۔ گیارہویں صدی کے طاقت ور حکمران راجندر چولا اول (1012–1044ء) نے جنوبی اور وسطی ہندوستان میں متعدد فتوحات حاصل کیں۔ ان فتوحات کا بیان Tiruvalangadu Copper Plates، Larger Leiden Copper Platesاور Karandai Copper Platesمیں محفوظ ہے۔ ان کتبوں میں فخر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ فاتح بادشاہ نے مفتوح علاقوں سے شاہی علامات اور دیوی دیوتاؤں کے مجسمے اپنے دارالحکومت منتقل کیے۔ ان مجسموں کو صرف مذہبی مقصد کے لیے نہیں بلکہ شاہی فتح کی یادگار کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ریاست کے مرکزی مندر اور اس کے دیوتا کی علامت پر قبضہ سیاسی غلبے کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔

چولا سلطنت اور مغربی چالوکیہ سلطنت کی طویل جنگیں اس حقیقت کو مزید واضح کرتی ہیں۔ South Indian Inscriptionsمیں راجادھی راجہ چولا کی کلیانی پر فتح کا ذکر موجود ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ چالوکیہ دارالحکومت سے ایک عظیم دوارپال (Dvarapala) کا مجسمہ بطورِ غنیمت تنجاور لایا گیا۔ اس مجسمے کا منتقل کیا جانا محض فن پارہ حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ یہ اس اعلان

کے مترادف تھا کہ فاتح نے مخالف سلطنت کی مذہبی اور سیاسی علامت کو اپنے اقتدار کے تابع کر لیا ہے۔

اسی طرح چندیل، کلچوری اور پرمار حکمرانوں کے کتبوں میں بھی جنگی فتوحات کے ساتھ مندروں اور مذہبی مراکز کا ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ ہر واقعے میں مندر کی تباہی کا بیان نہیں، لیکن یہ حقیقت نمایاں ہے کہ مندر اس دور میں شاہی اقتدار، دولت اور ریاستی وقار کا مرکز تھے۔ اسی لیے کسی ریاست کی شکست کے بعد اس کے مرکزی مذہبی مرکز کو فتح کی علامت بنانا ایک معروف سیاسی روایت تھی۔

شمالی ہندوستان میں اس کی ایک نہایت اہم مثال کشمیر کے راجہ **ہرش**(1089–1101ء) کی ہے۔ اس کے بارے میں معاصر سنسکرت مؤرخ کلہن نے اپنی مشہور تصنیف راج ترنگنی (کتاب ہفتم) میں تفصیل سے لکھا ہے۔ کلہن کے مطابق ہرش نے مالی بحران کے زمانے میں ایک ایسا محکمہ قائم کیا جس کا مقصد مندروں سے قیمتی دھاتیں، زیورات اور دیگر اموال شاہی خزانے میں منتقل کرنا تھا۔ کلہن لکھتا ہے کہ متعدد مندروں کے مجسموں سے سونا اور چاندی الگ کر کے خزانے میں جمع کی گئی۔ اس واقعے کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس کا بیان کسی غیر ملکی مؤرخ نے نہیں بلکہ ایک سنسکرت مورخ نے کیا ہے، جو خود اسی تہذیب کا نمائندہ تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات مندروں کی دولت سیاسی اور مالی ضرورت کے تحت بھی ضبط کی جاتی تھی۔

یہ تمام شواہد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں مندر

صرف عبادت کے مقامات نہیں تھے۔ وہ ریاستی خزانے، شاہی سرپرستی، زمینوں کی ملکیت اور سیاسی اقتدار کے مراکز بھی تھے۔ چنانچہ جب کوئی بادشاہ اپنے حریف کو شکست دیتا تو وہ اکثر اس کی انہی علامتوں کو نشانہ بناتا جو اس کی خود مختاری اور اقتدار کی نمائندگی کرتی تھیں۔

باب 3: محمود غزنوی اور غوری حملہ

محمود غزنوی

محمود غزنوی سے پہلے ان کے والد سبکتگین (942-977CE) نے مسلمانوں کی ایک بڑی حکومت سلطنت غزنویہ کے فرمانروا تھے جو وسط ایشیاء سے لے کر افغانستان تک قائم تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ سبکتگین سے قبل اموی سپہ سالار قتیبہ بن مسلم (669–715/716) اور اس کے بعد ڈھائی سو سال تک کوئی مسلم فاتح سرزمین ہند کی جانب نہیں بڑھا تھا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان سپہ سالار اور حکمرانوں کا مقصد ہند پر حملہ کرنے کے بجائے صرف وسط ایشیاء اور خراسان میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔ محمود غزنوی کا مقصد بھی ہندوستان میں کوئی مستقل حکومت کا قیام نہیں تھا بلکہ خیبر تک واقع اپنی سلطنت کی سرحدوں کا فتنہ گروں سے محفوظ رکھنا تھا۔

ہندوستان اس وقت سینکڑوں ہندو راجاؤں کے زیر تسلط تھا۔ ہندوستان کے مختلف خطوں میں بڑی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جو اکثر باہم برسرپیکار بھی رہتے تھے۔ ہندوؤں راجاؤں کے باہم

-

جنگ کی داستان تاریخ میں ہمیں کثرت سے ملتی ہیں۔ہند میں شمال کی جانب افغانستان میں مسلمانوں کی غزنی سلطنت تھی اور اسی کے ساتھ افغانستان کے کابل سے لے کر پنجاب تک اس وقت ہندو راجاؤں کا ایک خاندان حکومت کرتا تھا جسے ہندو شاہی کہا جاتا ہے۔

انھیں راجاؤں میں سے ایک ہندو راجہ جے پال (d. 1001) تھا جس کی حکومت پشاور سے آگے کابل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کی سرحدیں سبکتگین کی حکومت سے ملی ہوئی تھیں۔ راجہ جے پال کی طرف سے سرحدوں پر مختلف قسم کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ بعد ازاں جے پال نے جب دیکھا کہ سبکتگین کی حکومت طاقتور بن رہی ہے تو اس نے ایک بڑی فوج لے کر غزنی پر حملہ کر دیا لیکن پھر دونوں کے مابین صلح ہو گئی اور جے پال نے سبکتگین کی اطاعت قبول کر کے اپنی جان بچائی اور ساتھ ہی سالانہ خراج دینے کا بھی وعدہ کیا۔ سبکتگین نے جے پال کو رہا کر دیا اور وہ لاہور واپس آ گیا لیکن جے پال نے وعدے کے مطابق خراج نہیں بھیجا اور غزنوی سلطنت کے سفیروں کو قید کر لیا۔ راجہ کی اس حرکت کی وجہ سے سبکتگین نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ اس بار راجہ جے پال نے شمالی ہند کے کئی بادشاہوں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلایا تھا مگر ایک دفعہ پھر اسے شکست ہوئی اور وادی پشاور پر سبکتگین کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن 20 سال کی حکومت کے بعد سبکتگین کا انتقال ہو گیا۔

محمود اور ہندوستان

سبکتگین کے بعد ان کے بیٹے محمود غزنوی (998-1030 .r) نے تخت شاہی سنبھالا۔ اپنے والد کی طرح محمود غزنوی کی توجہ کا مرکز بھی صرف خراسان اور وسط ایشیاء کے علاقے تھے لیکن جب جے پال نے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس حاصل کرنے کے لیے محمود غزنوی سے اعلانِ جنگ کرتے ہوئے جلال آباد کے علاقے پر حملہ کر دیا[1] تو اس کے جواب میں محمود غزنوی کو بھی اپنی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے پشاور کے قریب جوابی حملہ کرنا پڑا جس میں جے پال کو بری طرح شکست ہوئی۔ جے پال کی موت کے بعد اس کا بیٹا انند پال لاہور کا راجہ بنا اور محمود نے اس کے ساتھ امن کا معاہدہ کر لیا۔

1001ء میں ہونے والا یہ واقعہ ہندوستان میں محمود غزنوی کا یہ پہلا حملہ تھا جس میں اس نے لاہور کے راجہ جے پال اور دریائے ستلج کے پار بٹھنڈہ فتح کر کے واپس چلا گیا۔

اسی حملے سے محمود غزنوی کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول ہوئی۔ محمود غزنوی نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ ہندو شاہی کے اُن تمام راجاؤں بالخصوص انند پال اور اس کے رشتہ دار راجاؤں سے معرکہ کرے گا جنھوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ چنانچہ محمود غزنوی نے مختلف ادوار میں ہندوستان میں ایک ایک راجہ کی سرکوبی کے لیے بارہاں حملے کیے۔ ان حملوں کی تعداد 17 ہیں جو شمال مغربی

[1] Sailendra Nath Sen, ***Ancient Indian History and Civilization***, (Dehli New: Age International, 1999) , p.342

ہند یعنی موجودہ پاکستان سے لے کر گجرات تک کے علاقوں پر کیا گیا تھا۔ ان میں سے اہم حملوں کی تفصیل یوں ہے:

بھاٹیہ: معاہدے کے ایک فریق راجہ بھاٹیہ نے خراج دینے سے انکار کر دیا اور سلطنت غزنویہ کی ماتحتی قبول نہ کی۔ محمود غزنوی نے 1004ء میں بھاٹیہ پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔

ملتان اور بہاولپور: محمد بن قاسم کے بعد ملتان میں مسلمان بڑی تعداد میں تھے۔ خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد ملتان کی ریاست پر قرامطہ اسماعیلی فرقے کے لوگ قابض تھے جن کا سربراہ ابو الفتح داؤد بن نصر تھا جس نے سلطنت سے بغاوت کر لی تھی۔ مسلم تاریخ کا ہر طالب عالم اس بات سے آگاہ ہے کہ اس دور میں بہت سے قرامطہ دنیائے اسلام کے خلاف کس قدر خطرناک سازشوں میں ملوث تھے لہٰذا ان کا سدباب ضروری تھا۔ بہاولپور کا راجہ وجے رائے اسلام دشمنی کے سبب قرامطہ کی مدد کیا کرتا تھا اس بناء پر محمود غزنوی نے پہلے بہاولپور پر ہی حملہ کیا اور پھر بہاولپور کے بعد ملتان کا رخ کیا مگر رستے میں انھیں راجہ جے پال کے بیٹے انند پال کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں جنگ ہوئی اور راجہ انند پال کشمیر فرار ہو گیا۔ قرامطوں کا قبضہ ختم کرنے کے بعد ملتان کی حکومت محمود نے راجہ جے پال کے نواسے سکھپال کے سپرد کر دی جس نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن بعد ازاں مرتد ہو گیا۔

پشاور: پنجاب کا اکثر علاقہ ابھی تک انند پال کے قبضے میں تھا۔ اس نے سلطان محمود کی بڑھتی ہوئی

دفاعی طاقت کو روکنے کے لیے شمالی ہند کے تمام راجاؤں سے مدد کی ایک عظیم الشان فوج جمع کر کے ہندو شاہی کے راجہ برہمن پال جو انند پال کا بیٹا تھا، اس کی قیادت میں پشاور کی طرف روانہ کیا۔ سلطان محمود کو اس کی اطلاع ملی تو وہ فوراً جوابی کاروائی کے لیے پشاور پہنچ گیا اور ایک گھمسان جنگ کے بعد راجہ کو شکست ہوئی۔

ملتان پر دوسرا حملہ: محمود کو سکھپال کے دھوکے کی خبر ملی تو اس نے دوبارہ ملتان کا رخ کیا، اسی دوران ملتان میں سکھپال فرار ہو گیا اور اقتدار پر دوبارہ داؤد قابض ہو گیا۔ چنانچہ محمود نے 1010ء میں داؤد سے جنگ کی اور ملتان کو دوبارہ فتح کر کے داؤد کو غزنی لے آیا۔

تھانیسر: اس کے بعد محمود غزنوی نے تھانیسر کی طرف پیش قدمی کی جو ہندوؤں کا مقدس تیرتھ بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ ہندو راجہ جنگ کے لیے مال و دولت اکٹھی کرتے، محمود غزنوی نے مال و دولت سے بھرے مندر پر حملہ کر دیا اور یہاں کی ایک مشہور مورتی توڑ کر غزنی کے چوراہے پر لٹکا دی۔ یہ چھٹا حملہ 1011ء کے لگ بھگ کیا گیا۔ یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ اس دور میں مندر پوجا پاٹ کے علاوہ جنگوں کے لیے سیاسی و اقتصادی تعاون کا مرکز بھی ہوتے تھے۔ مشہور مورخ رومیلا تھاپر کے مطابق یہ مندر اپنے چندوں سے ہندو شاہی افواج کی تنخواہوں کا بھی بندوبست کرتے تھے۔

کشمیر: انند پال کے بیٹے سے کشمیر اور بقیہ پنجاب کا اقتدار حاصل کرنے کے لیے محمود نے 1014

-

میں حملہ کیا، اس بار بھی اس کے مقابل کشمیر کے کچھ راجا تھے۔ یہ حملہ دو بار 1014 اور 1013ء میں کیا گیا جس میں محمود غزنوی کو فتح حاصل ہوئی۔

میرٹھ، متھرا، مہابن اور قنوج: انند پال کی مدد کے لیے میرٹھ، متھرا اور مہابن وغیرہ کے راجاؤں نے اپنی فوج محمود غزنوی کے خلاف بھیجی تھی، گویا وہ خود سلطان پر بلا جواز حملہ آور ہوئے تھے۔ چنانچہ سلطان نے ان پر بھی حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ اکثر راجاؤں نے اطاعت قبول کرلی۔ یہ نواں حملہ 1017ء میں کیا گیا۔ یہیں متھرا میں محمود ایک عظیم الشان مندر کی شان و شوکت دیکھ کر بہت حیرت زدہ ہوا اور اپنے مکتوب میں خاص طور پر اس مندر کی تعریف کی ہے۔

الور پر حملہ: اس کے کچھ عرصے بعد ہی سلطان نے گنگا کے قریب موجودہ الور کے مقام پر حملہ کیا ،البتہ پھر ان کے مابین معاہدہ ہو گیا اور سلطان نے وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ یہاں حملہ نہیں کرے گا۔

کوہستان نمک: انند پال کے زیر تسلط علاقوں میں سے بعض علاقے ابھی سلطان محمود کے قبضے میں نہیں آئے تھے اور اسے اس راجہ کی طرف سے خطرہ تھا۔ راجہ انند پال کی وفات کی بعد اس کا بیٹا ترلوچن اس کی جگہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطان محمود نے اس کے دارالسلطنت پر حملہ کیا۔ حملے کی خبر پاتے ہی ترلوچن تخت شاہی کو اپنے بیٹے بھیم پال کے سپرد کر کے کشمیر کے راجاؤں کے پاس روانہ ہو گیا، دریں اثناء محمود غزنوی نے یہ علاقہ فتح کر لیا اور ترلوچن پال جو کشمیر کے راجاؤں کی فوج

لے کر آرہا تھا اسے بھی دریائے جہلم قریب شکست دے دی۔

گجرات اور سومناتھ پر حملہ (1024CE)

محمود غزنوی نے ہندوستان پر جو حملے کیے، ان میں سب سے مشہور حملہ سومناتھ کا تھا۔ سومناتھ مندر برصغیر کی تاریخ کا مشہور و معروف مندر ہے۔ یہ مندر گجرات کاٹھیاوار کے علاقے میں سمندر کنارے واقع ہے جس کی یاترا کو دور دور سے لوگ آتے تھے۔ سومناتھ کے مندر میں دراصل ایک بہت شیو لنگ یعنی مردانہ عضوِ مخصوص کی شکل بت رکھا ہوا تھا۔ اس کی شہادت خود ہندوؤں کی مقدس کتاب پران بالخصوص ستھالا پران سے بھی ہوتی ہے۔ مشہور ایرانی مورخ و سائنس دان القزوینی (1203–1283) نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ سومناتھ کا یہ بت نہ تو زمین پر نصب تھا اور نہ ہی کسی دیوار کے سہارے اسے کھڑا کیا گیا تھا؛ بلکہ یہ ہوا میں معلق نظر آتا تھا۔ مندر کی چاروں دیواروں اور چھت و فرش پر یعنی چھ مقامات پر، برابر کی قوت والے مقناطیس (Magnets) لگا کر اس دھاتی بت کو ہوا میں معلق کر دیا گیا تھا۔ چونکہ چھ اطراف سے مقناطیس اس بت کو اپنی جانب کھینچتے تھے اور ان سب کی قوت یکساں تھی اس لیے یہ بت فضا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔[1] تاریخِ فرشتہ کے مصنف ہوا میں معلق پتھر کو کسی اور مقام غالباً تھانیسر سے منسوب بتاتے ہیں جو کہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہر کیف اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سومناتھ کے برہمن پجاریوں نے اپنے بت کے متعلق معجزات سنا کر عوام سے

[1] http://www.ibiblio.org/britishraj/Jackson9/chapter05.html (21 Feb 2014)

-

بھاری نذر وصول کرتے تھے۔ پجاریوں نے مال و زر چھپانے کے لیے ہی اسے کھوکھلا بنوایا تھا۔ سونا، چاندی، زیورات اور سکے اسی بت کے اندر چھپا دیے جاتے تھے۔

گجرات اس وقت سمندری لٹیروں کا مرکز بن چکا تھا، نیز ابو داؤد الفتح کے خاتمے کے بعد قرامطہ بھی یہاں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ یہاں موجود دیگر مسلمان بھی ہندو راجا کے ظلم کا شکار ہو رہے تھے۔ مشہور صوفی حاجی منگرولی شاہ نے سلطان کو گجرات کے مسلمانوں کی مظلومیت کی شکایت کی تھی۔ چنانچہ گجرات کے علاقے کنٹھ کے راجہ بھیم دیو(1063-1021) کی تادیب کے لیے سلطان روانہ ہوا اور راجپوتانہ کی راہ اختیار کی۔ سلطان سومناتھ پر حملہ آور نہ ہوتا اگر وہاں کے لوگ اسے کنٹھ کوٹ کا راستہ دے دیتے۔ مگر انھوں نے مزاحمت کی اس لیے سلطان کو حملہ کرنا پڑا۔

سلطان محمود جب سومناتھ پہنچا تو وہاں کے پجاریوں نے بہت تمسخر کیا کہ یہ فوج یہاں خود نہیں آئی بلکہ سومناتھ دیوتا نے انھیں تباہ کرنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔ مگر کچھ ہی دیر میں جنگ نے فیصلہ کر دیا کہ ان پجاریوں کے یہ دعویٰ غلط تھا۔ محمود غزنوی نے اِس لنگ کو پاش پاش کر دیا اور اس پر چڑھے ہوئے سونے سے بھی سب کچھ اتروالیا یہ بت جب توڑا گیا تو اس کے اندر سے بھی بہت سے ہیرے جواہرات اور سونا ہاتھ آیا۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ محمود غزنوی میں اپنے لشکر کی راہ میں آنے والے تمام مندروں پر حملہ

نہیں کیا بلکہ خاص انھی مندروں پر حملہ کیا جہاں سے اسے سرکشی کا سامنا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں محمود غزنوی نے مختلف مندروں میں قید ہزاروں دیوداسیوں کو آزاد کرایا اور مندر کے زر و جواہر لے کر ریاست غزنہ میں فلاحی کاموں پر صرف کیا۔

محمود غزنوی اور ہنود

ہندوستان کی تاریخ میں محمود غزنوی (r. 998-1030) کے بارے میں مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ محمود غزنوی نے ہندوستان کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور یہاں کے مندروں کو مسمار کر دیا۔ انگریز اور بہت سے ہندو مورخین محمود غزنوی کو ایک شدت پسند، لٹیرا اور دولت کی ہوس رکھنے والے ایک ایسے سلطان کی حیثیت سے بیان کرتے آئے ہیں جو ہندوستان صرف ہندوؤں کی سرکوبی اور مندروں کو لوٹنے کے لئے آتا تھا۔ جبکہ مسلمان مورخین انھیں ایک عادل اور خدا پرست بادشاہ کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں جو خالصتاً اسلام کے غلبے اور شرک کے خاتمے کے لیے ہندوستان آیا۔ محمود کی ذاتی شخصیت اور کردار کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے کیونکہ تاریخی ماخذ میں ان کے بارے میں متضاد معلومات ملتی ہیں تاہم ان کے سیاسی کردار کی جانچ آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ محمود غزنوی کے حملے کو جس طرح ہندو مسلم تنازع کے طور پر پیش کیا گیا ہے، وہ صرف انگریز مورخین کا بیانیہ ہے۔ خود ہندو مورخین نے کبھی اسے بیان نہیں کیا۔

اُس دور کے سنسکرت کتبات کسی تباہ کن "صدمے" یا واقعے کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً گوا (GOA) کے ایک کدمب راجہ کا 1038CE کا کتبہ، جو سومناتھ کی زیارت کا ذکر کرتا ہے، کسی تباہی یا بے حرمتی کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔

اس ضمن میں ویراول سومناتھ کا 1264CE کا وہ سنسکرت کتبہ بھی اہم ہے جسے Veraval Inscription of Chaulukya-Vaghela Arjuna کہا جاتا ہے۔ یہ کتبہ شہادت دیتا ہے کہ محمود کے حملے کے صرف دو صدیوں بعد، ہرمز سے آئے ایک مسلمان جہاز ران تاجر نورالدین فیروز نے سومناتھ کے قریب مسجد تعمیر کرنے کے لیے مقامی ہندو راجہ (سری چھاڈا) سے زمین حاصل کی، اور یہ سب مقامی حکام، پجاریوں اور معززین کے تعاون سے ہوا۔ سنسکرت متن میں اس مسجد کو "دھرم استھان" (مقدس مقام) کہا گیا۔ یہ سومناتھ ہی کی سرزمین پر ہندو مسلم تعاون اور مسلمانوں کے قابلِ قدر تجارتی شراکت دار ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اس کتبے میں پوری تفصیل موجود ہے کہ نور الدین نے یہ زمین مقامی راجپوت سردار راجا کُل شری چھاڈا (Raja Sri Chhada) سے خریدی۔

یہ درست ہے کہ محمود غزنوی کے ان حملوں کی وجہ سے یقیناً عام آبادی بھی متاثر ہوئی ہو گی جس میں ہندو مسلم دونوں شامل تھے۔ مگر یہ حملے سیاسی نوعیت کے تھے اور حکومت کے استحکام و توسیع کے خاطر تھے۔ محمود کا مقصد یہاں غیر مسلموں کو مسلمان بنانا نہیں تھا۔ مستند تاریخ میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا ہو۔ اپنے علاقے میں

بھی اس کی مذہبی پالیسی رواداری پر مبنی تھی۔ ہندوستان پر محمود کے قبضے کے بعد بھی ہندوؤں کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی کھلی آزادی تھی حتیٰ کہ انھیں سلطنت کے انتظامی امور میں بھی شرکت دے رکھی تھی۔ محمود کی فوج میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے جو محمود غزنوی کے جانشینوں کے پاس آخری وقت تک رہی ان میں سردار تلک، سوندی رائے اور ہج رائے کے نام تاریخ میں مشہور ہیں جو فوج کے اعلیٰ عہدوں تک رہے۔ نیز اس کی سلطنت کے مرکز غزنین میں بھی ہندوؤں کا محلہ تھا جہاں وہ اپنی مذہبی رسوم آزادی سے ادا کرتے تھے۔ مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند محمود غزنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمود کی زندگی کی زبردست خواہش فتح اور حکومت کی توسیع تھی اور اسی میں اس نے ساری زندگی صرف کر دی۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ اس نے وسط ایشیاء اور فارس کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا اور عباسی خلیفہ بغداد کا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ 1039ء میں مر گیا۔ اس نے سپاہیانہ کامیابی اور لوٹ مار کے لیے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ کئی مندروں اور جلایا لیکن اس لیے کہ ان میں زر و مال جمع تھا۔ اس نے کسی کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے متعدد ہندو افسروں اور سپاہیوں کو اپنی فوج میں بھی ملازم رکھا' جو اس کے لیے وسط ایشیاء اور ایران میں لڑتے رہے۔[1]

[1] ڈاکٹر تاراچند۔ **مختصر تاریخ اہل ہند۔** ص127۔ بحوالہ: شیخ محمد اکرام۔ آبِ کوثر، صفحہ 60۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

محمود غزنوی کی مشہور ہندو دشمنی پر تبصرہ کرتے ہوئے مفتی شوکت علی فہمی لکھتے ہیں:

محمود کے کردار کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بس وہ نئی نئی فتوحات کا شائق تھا، اسے کسی قوم یا مذہب سے عناد نہ تھا، اگر فی الحقیقت محمود ہندو راجاؤں یا ہندو عوام کا دشمن ہوتا تو کیا وہ ہندو راجاؤں کی بار بار شورش پسندیوں کے باوجود ہر مرتبہ ان کی اسی طرح معافیاں دیتا رہتا جس طرح کہ وہ دیتا رہا ہے۔ حالانکہ محمود کے پاس ان کو تہیہ تیغ کرنے کا جواز خود ان کی راجاؤں نے اپنی عہد شکنیوں اوار بغاوتوں سے فراہم کر دیا تھا ااور اگر محمود کو محض اس لیے ہندوؤں کا دشمن کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کے ہندو راجاؤں کے خلاف بار بار یورش کی تو اس سے زیادہ یورشیں محمود نے غزنی، ترکستان، بلخ، بخارا، سیستان، خراسان، غور، خوارزم اور دوسرے اسلامی علاقوں میں خود مسلمانوں کے خلاف کی ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے تخت سے اتار کر خود تخت پر قبضہ جمایا اور ساری عمر قلعہ میں نظر بند رکھا۔۔۔ محمود اگر فی الحقیقت ہندوؤں کا دشمن ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنے لشکر میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو سپاہی نہ بھرتی کرتا اور ہندوستان میں ہندو عمال نہ مقرر کرتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ محمود غزنوی محض فتوحات کا شائق تھا اور اس پر فرقہ پرستی کا الزام لگانا کسی طرح بھی درست نہیں۔[1]

[1] مفتی شوکت علی فہمی۔ صفحہ 85

محمود غزنوی اور ہندو مندر

محمود غزنوی اور ہندو دشمنی کے تاثر کے خلاف اور ایک بڑا ثبوت اس زمانے میں ہندو مندروں کی تعمیر ہے۔ ایک طرف تاثر دیا جاتا ہے کہ ان حملوں کے نتیجے میں ہندوستان میں مندر سازی کا سلسلہ رک گیا یا ہندو مذہبی زندگی مفلوج ہو گئی۔ لیکن اگر اسی زمانے کی تعمیراتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے۔

محمود کی مہمات جس زمانے میں چل رہی تھیں، اسی عرصے میں برصغیر میں عظیم الشان مندروں کی تعمیر نہ صرف جاری رہی بلکہ گیارہویں صدی ہندوستانی مندری فنِ تعمیر کے عروج کے ادوار میں شمار ہوتی ہے۔ اسی دور میں تنجاور کا بریہدیشور مندر (1003–1010ء) مکمل ہوا، کنداریا مہادیو مندر (تقریباً 1025–1050ء) کی تعمیر جاری رہی، موڈھیرا سورج مندر (1026–1027ء) تعمیر یا مکمل کیا گیا، جبکہ لنگراج مندر بھی گیارہویں صدی میں تعمیر و توسیع کے مراحل سے گزرا۔ مزید یہ کہ جن علاقوں پر محمود نے حملے کیے، وہاں بھی تمام قدیم مذہبی مراکز ختم نہیں ہوئے۔ مثال کے طور پر کروکشیتر (تھانیسر) اپنی مذہبی حیثیت برقرار رکھتا رہا، متھرا مسلسل ہندو زیارت کا مرکز بنی رہی اور بعد کی صدیوں میں وہاں نئے مندروں کی تعمیر بھی ہوتی رہی، جبکہ گجرات میں سومناتھ کے علاوہ متعدد قدیم مندروں کی مذہبی سرگرمیاں جاری رہیں۔

محمود کی راہ میں آنے والے ہزاروں مندر محفوظ رہے، متھرا کا عظیم الشان مندر دیکھ کر نہ اس

میں بت شکنی کا عزم اٹھتا ہے اور نہ ہی بت فروشی کا ارادہ، بلکہ وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسی عظیم الشان عمارت بنانا چاہے تو لاکھوں سرخ دینار خرچ کر کے بھی نہیں بنا سکتا اور شاید دو سو برس میں بھی ایسی عمارت نہ بن سکے۔[1] نیز محمود غزنوی نے ہندوؤں کے ساتھ معاملات ایسے رکھے کہ انھیں فوج جیسے حساس جگہ پر بھی فائز کیا ہے۔ اپنے پورے دورِ حکومت میں نہ وہ غیر مسلموں کو بزور مسلمان بناتا ہے نہ ہی کسی کو اس کی تبلیغ کرتا ہے۔ یہ سبھی حقائق اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں مذہبی اعتبار سے محمود کو خاص ہندوؤں سے کوئی بیر نہ تھا۔ ایک دیانت دار مورخ کے لیے محمود پر خاص ہندو دشمنی کا الزام لگانا ممکن نہیں۔ تاہم دیانت داری کے ساتھ اس رائے کا اظہار کیا جاسکتا ہے کہ ان مخصوص مندروں کے مکمل انہدام کی کاروائی نہ صرف بے حکمت بلکہ غیر مسلموں سے متعلق اسلامی تعلیمات کے بھی منافی تھی۔

[1] Reynolds Jammes, trans. ***The Kitab-i-Yamini: Historical Memoirs of the Amir Sabakt-agin, and the Sultan Mahmud ofGhazna****.(London: Oriental Translation Fund of Great Britain and Ireland. 1858),* p. 455

-

ایران سے ہندوستان تک کا وہ علاقہ جو سلطان محمود غزنوی کے زیر تسلط رہا۔

www.afghanland.com

ہندوستان؛ محمود کے بعد

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ذکر کیا گیا ہے کہ محمود غزنوی کا مقصد یہاں سلطنت قائم کرنا نہ تھا بلکہ جوابی کاروائی کرنا تھا، اسی لیے اس نے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد یہاں کوئی باقاعدہ سلطنت قائم نہیں کی بلکہ یہاں سے مال غنیمت حاصل کر کے دوبارہ غزنی چلا گیا تاہم لاہور میں اپنے محبوب غلام ایاز کو حاکمِ پنجاب مقرر کر دیا جبکہ انند پال اور بعض دیگر علاقوں کے راجاؤں کی طرف معذرت نامہ ملتے ہی اسے قبول کر لیا گیا اور غزنی کے ماتحت حکومت کی اجازت مل گئی۔ جبکہ بعض راجاؤں نے یہاں وہاں پناہ اختیار کر لی۔ محمود غزنوی کے بعد بھی مسلمانوں کی حکومت موجودہ پاکستان کے علاقوں میں قائم رہی لیکن شمالی ہند کے تقریباً سبھی علاقے واپس

-

ہندو راجاؤں کے پاس ہی رہے۔

محمود غزنوی کے اس کی سلطنت محمود کے جانشین میں چلتی رہی اور سبھی ریاستیں غزنی سلطنت کی اطاعت گزار رہیں۔ لیکن 1051 میں اسماعیلیوں نے محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کے خلاف بغاوت کر دی اور یہاں ایک بار پھر سومرو خاندان کی حکومت قائم ہوئی، جس کا دار الحکومت ٹھٹھہ تھا۔ یہ سلطنت تین سو سال تک موجود رہی۔ گمان غالب ہے کہ سومرو خاندان نے اسماعیلی مذہب ترک کر دیا اور اہل سنت یا اثنا عشری شیعیت میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد سندھ کے یہ بعض اسماعیلی جنوب کی طرف موجودہ بھارت کے صوبہ گجرات میں منتقل ہو گئے اور وہاں انہوں نے ایک مستقل کمیونٹی کی بنیاد رکھی جو آج تک وہاں اور موجودہ پاکستان میں بوہرہ/بوہری کے نام سے موجود ہے۔ ہندوستان میں محمود کے بعد اکثر حکومتیں بغاوت کر کے آزاد ہو گئی اور ہندوستان میں طوائف الملوکی کی سی کیفیت ہو گئی جو کہ آئندہ حملہ آور سلطان شہاب الدین غوری کی آمد تک رہی۔

غوری یلغار

گیارہویں صدی کے اختتام پر افغانستان میں ایک نئے ترکی حکمراں غیاث الدین (r. 1163–1202) نے غزنی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اس کے چھوٹے بھائی سلطان شہاب الدین غوری (r. 1202-1206) جسے عام طور سے محمد غوری کے نام سے جانا جاتا ہے، نے ہندوستان اُن علاقوں کی

زمام اقتدار اپنے ہاتھ لینے کا ارادہ کیا جو اس وقت سلطنت غزنی کا حصہ تھیں۔ چنانچہ پہلے اس نے 1175ء کے بعد سے بلوچستان اور سندھ کے بعض علاقوں پر حملے کر کے اپنا اقتدار مضبوط کیا اور پھر 1185ء میں سلطنت کے بقیہ حصے یعنی پنجاب کی طرف حملہ کر کے غزنوی سلطنت کا آخری حکمران خسرو ملک ثانی کو گرفتار کر لیا۔

سلطان شہاب الدین غوری کے حملوں سے قبل ہندوستان کے مشہور راجپوت بادشاہ پرتھوی راج چوہان(1165-1193) نے خسرو ملک سے مشرقی پنجاب اور دہلی کا علاقہ چھین لیا تھا جو کہ غزنی سلطنت کا حصہ تھیں۔ پرتھوی راج ایک بہادر اور بے خوف شخصیت کا مالک تھا۔ دہلی سے اجمیر تک کی متحدہ سلطنت پر یہ تن تنہا حاکم تھا۔ شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج سے ان تمام علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جسے پرتھوی راج نے رد کر دیا کیونکہ وہ ان علاقوں کو خود فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنا چکا تھا۔ محمد غوری نے فوراً ہی ایک چھوٹے سے لشکر کے ذریعے دہلی سے قریب واقع بھٹنڈہ کا قلعہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ پرتھوی راج کو جب بھٹنڈہ پر حملے کی اطلاع ملی تو اسے اپنی سلطنت پر خطرات کے بادل منڈلاتے محسوس ہوئے، چنانچہ وہ متعدد راجاؤں اور دو لاکھ سپاہیوں کے ہمراہ غوری کے مقابلے لیے نکل کھڑا ہوا۔ شہاب الدین غوری کی مختصر سی فوج پر اس عظیم الشان لشکر کا حملہ 1191ء میں ہوا۔ ترائن (کرنال) کے مقام پر دونوں افواج آمنے سامنے ہوئی، ہندو افواج بڑی جانفشانی سے حملہ آور کا مقابلہ کیا اور غوری کو شکست دے کر بھگا دِیا۔

-

ہندوستانی راجاؤں کے سامنے ایک بار شکست کھانے کے باوجود محمد غوری نے 1192ء میں دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت کی۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ غزنی کے مشہور عالم دین امام رازی کا مالی تعاون بھی حاصل تھا۔ چنانچہ 1193ء میں محمد غوری دوبارہ ہند پر حملہ آور ہوئے اور متعدد راجاؤں کی مشترکہ افواج کو شکست دے کر سندھ، گجرات، دہلی اور تقریباً پورا شمالی ہندوستان فتح کر لیا جو سلطنت غزنی کا حصہ تھیں۔ انھوں نے دہلی میں اپنی حکومت (سلطنتِ غلامان) کی بنیاد رکھی اور اپنے ایک غلام قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام مقرر کر غور لوٹ گئے۔

محمد غوری گو کہ ایک طویل عرصے تک ہندو راجاؤں کے مقابل رہے لیکن ان کی بیشتر جنگیں سیاسی نوعیت کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو راجاؤں نے بھی جنگی مہمات میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ 1186 میں ترائن کی لڑائی میں جب غوری نے لاہور پر حملہ کیا تو جموں کے راجہ وجے دیو (1165-1216) نے سلطان کا بھرپور ساتھ کیا۔ اس جنگ کے بعد خود محمد غوری نے بھی فراخ دلی اور وسعت نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شکست خوردہ راجاؤں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اس نے پرتھوی راج کے بیٹے کو اجمیر کا حاکم مقرر بھی کیا لیکن بعد ازاں غداری کے جرم میں معزول کر دیا گیا۔ دوسری جانب خود پرتھوی راج کی فوج اور انتظامی عہدوں پر بھی مسلمان بغیر امتیاز کے موجود تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کو پرتھوی راج سے کوئی شکایت نہ تھی۔ یہ سارا منظر خالصتاً سیاسی نوعیت کا تھا۔ ہندوستان پر غوری یلغار کی وجوہات کے بارے میں بدھ مت کے مشہور عالم ڈاکٹر الیگزینڈر برزن لکھتے ہیں:

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی برصغیر میں غوری مہم بے دینوں کو مسلمان کرنے کے لیے لڑی جانے والی کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی بلکہ بنیادی طور پر اس پیش قدمی کا مقصد علاقہ فتح کرنا تھا، وہ چاہے مسلمانوں کا ہو یا غیر مسلموں کا۔ ہر چند کہ ملتان کی اسمٰعیلی مملکت کے خلاف فوجی کارروائی کو ایک جہاد کا نام دیا جاسکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ غوریوں نے اپنی فوجوں کو یکجا کرنے کے لیے مذہبی جنگ کے تصور کا استعمال کیا ہو، مگر اس مسلمان قائد کے جوش و خروش کو غالباً بے دینوں کو مسلمان بنانے کے جذبے نے نہیں بلکہ مال غنیمت اور اقتدار کے امکان نے تحریک دی ہو گی۔[1]

یہ واضح ہے کہ محمد غوری نے ہندوستان میں ایک بار شکست کا منہ دیکھنے کے باوجود ہندوستان پر لشکر کشی کی۔ اس کا بنیادی مقصد یہاں کی عبادت گاہوں کو تباہ کرنا یا ہندوؤں کا زبردستی مسلمان بنانا نہیں تھا، تاہم بدھ اور مغربی مورخین نے ان مہمات کے دوران غوری افواج سے سرزد ہونے والے بعض ظلم و ستم کے جو واقعات بیان کیے ہیں ایک غیر جانبدار مورخ کے لیے انھیں یکسر نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہے۔

[1] http://www.berzinarchives.com/web/ur/archives/e-books/unpublished_manuscripts/historical_interaction/pt3/history_cultures_20.html

-

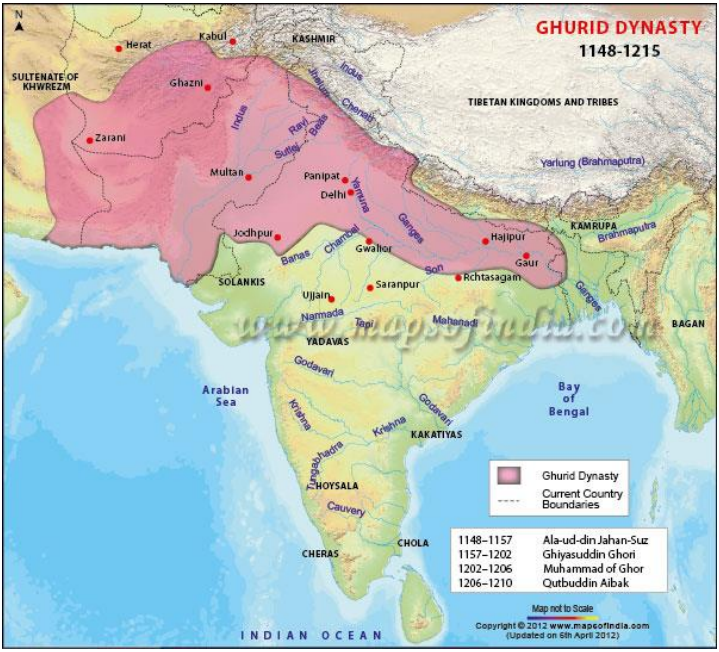

غوری سلطنت

محمود اور غوری کے حملوں کا اثر

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے ہندوستان پر ان پے در پے حملوں ہندوستان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ محمود سے قبل اہل ہند کے لیے اسلام کوئی اجنبی دین نہ تھا مگر مسلمانوں کا اثر رسوخ محمود کے بعد زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بالخصوص شمالی ہند میں مسلمانوں پر ہندوؤں راجاؤں نے ٹیکس لگا رکھا تھا انھیں اس سے بھی نجات ملی۔

محمود غزنوی کے اس حملے کے بعد وسط ایشیاء سے صوفیاء کی بڑی تعداد نے یہاں کا رخ کیا جس میں غوری کے حملے کے بعد مزید اضافہ ہوا۔ ان صوفیا کی بدولت یہاں بھی مسلم تصوف کی ریت قائم ہوئی۔ ان صوفیاء میں خواجہ معین الدین چشتی (1141)، شیخ جلال الدین تبرزی (1159)، بابا فرید الدین مسعود (1173) اور شیخ بہاؤالدین ذکریا (1170) کے نام نمایاں ہیں۔ اس سے پہلے بھی کچھ صوفیاء یہاں آئے تھے مگر ان کی تعداد نہایت کم تھی۔ ان صوفیاء کے ہاتھوں بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی طرح ہم بتا چکے ہیں کہ اسی زمانے میں لگ بھگ 1067ء میں شیعہ بوہری جماعت بھی یمن سے ہجرت کر کے گجرات آباد ہوئے اور اس خطے کو اپنا روحانی مرکز بنایا۔

محمود غزنوی کے ساتھ ایک مشہور سائنس دان اور مورخ و محقق ابوریحان البیرونی بھی تھے۔ یہ مسلمانوں کے وہ پہلے عالم تھے جنھوں نے ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت سیکھ کر ان کے عقائد اور ان کی تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کیا ۔ انھوں نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جو اب تک پڑھی جاتی ہیں۔ ہندوؤں کے حوالے سے ان کا سب سے اہم کام کتاب الہند سمجھا جاتا ہے جس کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے انھیں بابائے علم الہند Father of Indology بھی کہا جاتا ہے۔

محمود غزنوی اور محمد غوری کچھ صدی کے وقفے سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ محمود غزنوی اور محمد غوری دونوں کو ہی ہنود کے ہاں خاصی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان دو فاتحین کے نام مذہبی انتہاء کے حوالے سے خاص طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان دونوں

ہی فاتحین کے مقصد میں کسی مذہبی عنصر کے بجائے فوجی، سیاسی اور اقتصادی فائدہ اٹھانے کی نیت کارفرما تھی، اسے مذہبی شدت پسندی کہنا خلافِ حقیقت ہو گا جس کی تفصیل ہم گزشتہ صفحات میں دے آئے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود تہذیب و تاریخ کا ہر طالب علم اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ ان دو فاتحین کے متعلق بے شمار مندروں کو مسمار کرنے اور ہندوؤں سے بُرا سلوک کرنے کی داستان میں حقانیت نہ ہو مگر محمود کے بعد مسلم فاتحین کی کثرت نے یہاں کے مسلمانوں کے رعب اور میں خاصا اضافہ ہوا، اور کئی مندروں کے پجاریوں سے عوامی دولت چھیننے اور مندروں کے انہدام کی وجہ سے ہندوؤں کے مذہبی طبقے برہمن میں مسلمانوں کے متعلق نفرت کی لہر پھیل گئی۔ ہم سوچ سکتے ہیں کہ اس حملے کی بنیاد پر ہونے والے پروپیگنڈے کا اثر لازماً ہندوستان میں اسلام کی دعوت پر بھی پڑا ہو گا۔ تاہم ان فاتحین کے بارے میں یہ بات غیر جانبداری سے یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ان کا عدل ہندوستان میں مسلم و غیر مسلم دونوں ہی کے ساتھ یکساں تھا۔

زیر بحث دور میں ہندوستان میں مسلمان

محمود غزنوی کے جانے کے بعد میں شمالی ہند کے علاوہ مسلمانوں کی بڑی آبادی سندھ سے لے کر گجرات تک موجود تھی۔ شہروں میں جامع مسجدیں بھی تھیں اور دیہاتوں میں چھوٹے مدارس

بھی تھے۔ مغربی ہند، گجرات کے شہر کچھ میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ابراہیم نامی بزرگ کا ایک مزار بھی ملتا ہے جس کی تاریخ 1159 ہے۔ جنوب مغربی ہند میں واقع مشہور سولہ کھمبا مسجد کی تاریخ بھی بارہویں صدی عیسوی کی ہے۔

یہاں مسلمان مقامی حیثیت سے رہتے رہے اور ہندو بادشاہوں کا رویہ بھی ان کے ساتھ اچھا رہا جو غزنوی سلطنت کے ماتحت تھے۔ کئی مسلمان سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے حتیٰ کہ سومناتھ کے راجہ کے ہاں بھی کئی مسلمان عہدیدار تھے جو محمود کے خلاف بھی جنگ میں شریک رہے۔[1] ہمیں تاریخ سے کوئی ایسی مثال نہیں مل سکی ہے کہ یہاں کے مسلمان کسی راجہ کے عتاب کا شکار ہوئے ہوں۔ بلکہ تیرہویں صدی کے ایرانی مورخ سدید الدین محمد عوفی (c. 1171-1242) بیان کرتے ہیں کہ گجرات کے علاقے کھنبائت میں ہندو یا پارسیوں کے ایک گروہ نے مسجد پر حملہ کرکے اسے مسمار کردیا۔ مسجد کے خطیب نے بھیم دیو کے پوتے سِدھ راج سلونکی (Siddhraj Jaysinh: 1094-1143) سے شکایت کی جس پر راجہ نے فوری ایکشن لیتے ہوئے حملہ آوروں کو سزا دی اور مسجد بھی دوبارہ تعمیر کروائی۔ اسی طرح تاریخ میں ہمیں کئی مسلمانوں کے نام ملتے ہیں جو ہندو راجاؤں کے ہاں منتظم کی حیثیت سے اچھے مقام پر فائز تھے۔ پرتھوی راج چوہان کی مثال بھی ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ بعد ازاں یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو مسلمان مزید خوشحال ہوئے۔

[1] Tara Chand, p.45-46

کھجاراہو: دیوی جگدمبی مندر (تعمیر: دسویں سے بارہویں صدی عیسوی)۔

یہی صورت حال جنوبی ہند کی بھی تھی۔ گیارہویں صدی کے آخر تک یہاں مسلمان کی بڑی کمیونٹی بن چکی تھی۔ مسلمانوں کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں تامل قوم کے بہت سے ہندو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ عرب مسلمانوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کیں اور ان سے کئی مخلوط نسل پیدا ہوئیں جو آج تک موجود ہیں، ان میں راوتن، لبی اور موپلا(Mappilla) خاص طور پر مشہور ہیں۔ تامل ناڈو کے راوتن تو اس بارے میں یقینی حیثیت سے زبانی روایت سناتے ہیں کہ ان کے اجداد کو صوفی بزرگ نطہر ولی (11/12th Century) نے ہی اسلام قبول کروایا تھا۔ ان کا مزار آج بھی ترچناپلی میں واقع ہے۔ مصنف Murray T.Titus جنوبی ہند بالخصوص

مالابار میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی تہذیب کی اثر پذیری کے متعلق لکھتے ہیں:

> مالابار کے ساحل پر اشاعتِ اسلام کی ایک دلچسپ وجہ وہاں کے لوگوں کو مسلمان بنانے میں کالی کٹ کے Zamorin کا کردار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے نچلی ذات کے لوگوں کی آزادانہ طور پر مسلمان ہونے کی حوصلہ افزائی کی۔۔۔ اُس نے اس حد تک حکم دیا تھا کہ اُس کی حکومت میں ماہی گیروں کے ہر خاندان میں ایک یا ایک سے زیادہ مردوں کی پرورش مسلمان کے طور پر ہونی چاہیے۔ اس طرح ہندو معاشرے کی ایک سیاسی ضرورت نے جنوبی ہندوستان میں اشاعت اسلام میں ہاتھ بٹایا۔۔۔ ہندوستان کی نچلی ذاتوں میں سے برگشتہ ہونے والوں نے بھی معاشرتی آزادی کا درجہ حاصل کرنے کا موقع پاتے ہوئے جو کہ ہندومت کے ظالمانہ اور غیر لچکدار ذات پات کے نظام نے انہیں دینے سے انکار کر رکھا تھا اسلام کو خوش آمدید کہا۔[1]

شمالی ہند کی نسبت جنوبی ہند کے باشندوں نے اسلام میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور یہاں کئی مقامی راجاؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی زمانے میں جزائر مالدیب کے حاکم کالامنجا (1200ء) نے اسلام قبول کیا اور اس خطے میں اشاعت اسلام کی راہ ہموار ہوئی جس کا اثر ہندومت پر بھی

[1] Murray T. Titus, ***Islam in India and Pakistan,*** (Karachi: Royal Book Company), 1990, p.39

ہوا۔ بقول ڈاکٹر تاراچند ساتویں صدی کے بعد جنوبی ہند میں ہندومت میں جو کچھ اصلاحات اور انقلابات آئے وہ غالباً اسلام ہی کے اثرات کے نتائج ہیں۔[1]

ہندو امرائے سلطنت اور غیر ہنود

ہندمت سے متعلق اپنی تفصیلی کتاب میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ بدھ مت اور جین مت ہمیشہ سے ہندوؤں اور بالخصوص شیومت کے پیروکاروں کے لیے خطرہ رہا ہے؛ کیونکہ ظاہر پرستی کی مخالف ان دونوں مذہبی تحریکات کی طرف عوام الناس راغب ہوئے جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہندو بادشاہوں کو موقع ملا انھوں نے جین اور بدھ مت کے پیروکاروں کو دبانے کی بھرپور کوشش کی۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سیاحت کرنے والا مشہور چینی سیاح ہیون شیانگ کے مطابق اس وقت ایودھیا میں بدھوں کے ایک سو ویہار تھے، لیکن بعد میں جب بودھ مت کے خلاف شیومت کی تحریک نے زور پکڑا تو ہندوستان میں پھیلے بدھوں کی یہ قدیم عبادت گاہیں یا تو مسمار کر دی گئیں یا انھیں شیومندر میں تبدیل کر لیا گیا۔ جنوبی ہند مدورائی میں 8000 جین پیرکاروں کے قتل کی داستان بھی شیومت کی مقدس کتابوں میں مرقوم ہے مگر مورخین اس واقعے پر شکوک کا اظہار کرتے ہیں۔

[1] Dr Tara Chand, ***Influence of Islam in India,*** (Allahabad: Indian Press Limited) P.43

غزنوی اور غوری کے ہی دور میں جنوبی ہند میں ہندو بادشاہ کے وزیر باسو–(Basava: 1134 1196) کی طرف سے جین پیروکاروں کو زبردستی ہندو بنایا جارہا تھا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے جین تیر تھنکر کے بت کو گرا کر شیو دیوتا کا بت نصب کیا تھا۔[1] اسی طرح ایک اور راجہ وشنو وردھن (r.1108–1152 CE) نے بھی جین مت کے پیروکاروں کو اس بات کا عندیہ (Ultimatum) دیا تھا کہ وہ ہندو مذہب قبول کرلیں ورنہ انھیں گرم تیل میں پھینک دیا جائے گا۔ البتہ جین مت کے پیروکاروں نے ہندو رسوم و رواج اور دیوتاؤں کو اپنے مذہب میں جگہ دے کر اپنی جان بخشوائی۔[2] اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کا پہلا بت شکن محمود نہیں بلکہ خود شیو مت کے پیروکار تھے البتہ انھوں نے اس کی جگہ اپنے بت نصب کیے۔

[1] Volume 14 of Lala Sundar Lal Jain research series ***Jainism: an Indian Religion of Salvation***, Editor: Helmuth von Glasenapp, (Motilal Banarsidass Publ.1999). P.71

[2] Ibid, 73

باب4: وسطی عہد

سلاطین دہلی

1206CE میں غوری کی شہادت کے بعد ان کی فوج کے جرنیل اور نامزد گورنر قطب الدین (r. 1206-1210) نے غوری سلطنت کے ہندوستانی حصوں پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ قطب الدین ایبک سے شروع ہونے والے دور یعنی 1206 سے 1526 تک ہندوستان پر حکومت کرنے والی کئی حکومتوں کو مشترکہ طور پر دہلی سلطنت کہا جاتا ہے۔ ان میں قطب الدین ایبک کے خاندان غلاماں سے لے کر 1526ء تک کی حکومتیں شامل ہیں جس کے بعد دہلی کی آخری سلطنت مغلیہ سلطنت میں ضم ہوگئی۔

سلطنت دہلی کے دور میں ہمیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ہاں ازدواجی رشتے قائم ہونے کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور ریاست کے عسکری شعبے میں بھی ہندوؤں کی موجودگی کی شواہد ملتے ہیں۔ 1525ء میں جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ فوج سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ افغانوں کی آخری جنگ بھی ایک ہندو امیر اور جنرل کی سرکردگی میں لڑی

گئی۔[1] ان سبھی باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی اور تہذیبی کافی گہرا ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں برصغیر میں مذہب کی اس صوفیانہ تشریح و تعبیر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو بارہویں صدی کے بعد اپنے عروج پر تھی۔ اس دور میں ہمیں مسلمان صوفیاء، ہندو یوگی، سنیاسی اور سادھوؤں کا باہم میل جول بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ جہاں تک ہنود سے تعلقات کا معاملہ ہے تو سلاطینِ دہلی میں سے بیشتر مسلم سلاطین کا برتاؤ ہندوؤں کے ساتھ اعتدال پسندی پر مبنی تھا۔

تغلق خاندان کے بادشاہ سلطان فیروز شاہ تغلق (1351-1388) گو مذہبی عقائد میں آزادی کا قائل نہ تھا، لیکن اس کی یہ سختی صرف مسلمانوں کے بعض گروہوں کے ساتھ تھی جو اس کے نزدیک گمراہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کے لیے اس نے اسلام قبول کرنے پر انعامات و اکرام کا اعلان کر رکھا تھا مگر کبھی کسی غیر مسلم کو جبراً دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی سعی نہ کی۔ بلکہ فیروز شاہ کے حالاتِ زندگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے فلسفہ، نجوم، ہیت اور الٰہیات سے متعلق کتابوں کا ترجمہ بھی کرایا۔

فیروز شاہ پر بعض مندروں کو مسمار کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے، فیروز شاہ نے خود اپنی سوانح میں بھی کچھ نئے مندروں کو منہدم کرانے کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ واضح ہے کہ فیروز شاہ کا یہ عمل

[1] کنور محمد اشرف۔ **ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں**۔ مترجم: قمر الدین۔ صفحہ 130۔ ترقی اردو بیورو، دہلی۔ 1989

انتہا پسندی یا مذہبی تعصب کا مظہر نہ تھا۔ ہندوستان میں مسلم قوانین کی رو غیر مسلموں کے یہ اختیار نہ تھا کہ وہ نو آباد مسلم علاقوں میں مندر تعمیر کریں کیونکہ وہ آبادی مسلمانوں کے لیے خاص تھی۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نئے شہر آباد کیے تھے، یہاں ہندوؤں نے مندر بنائے جو قوانین کی خلاف ورزی تھی، چنانچہ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑ دیے گئے۔ جبکہ دیگر علاقوں میں مندروں کی تعمیر پر کوئی ممانعت نہیں تھی جس کی وضاحت اس کی زیر نگرانی تصنیف کردہ سوانح "تاریخ فیروز شاہی" اور فتاوی فیروز شاہی میں مذکور ہے کہ ایسے علاقوں میں شریعت کی رُو سے مندروں کی تعمیر کو نہیں روکا جائے گا۔

فیروز شاہ کے متعلق مورخین اتفاق کرتے ہیں کہ یہ نہایت کامیاب اور عادل بادشاہ تھے۔ انھوں نے اپنے دور میں رفاہِ عامہ کے لیے بہت سے مدارس، مساجد اور ہسپتال بنائے، تمام ملک میں امن وسکون تھا اور ہر مذہب کے لوگ اس بادشاہ سے مطمئن تھے۔ تاریخ فرشتہ کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ کٹھیر میں چودھری کھرکو نے جب بدایوں کے حکمراں سید محمود اور اس کے بھائیوں کو قتل کر دیا تو بادشاہ نے نہایت طیش کی حالت میں بداؤں پر حملہ کیا اور تین سیدوں کی موت کے عوض ہزاروں ہندوؤں کا قتل عام کیا اور اس حملے میں فیروز شاہ کی بدولت اس قدر زیادہ تعداد میں ہندو مارے گئے کہ خود مقتول سادات کی روحیں ان سے سفارش کرنے لگیں۔ لیکن صاحب فرشتہ کے اس بیان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ متفق علیہ تاریخ کے مطابق فیروز نے جتنی لڑائیاں لڑی ان میں اسے محض اپنی نرم دلی کی وجہ سے کوئی خاص کامیابی

حاصل نہ ہو سکی۔ اس صورت میں بدایوں کے حکمراں کے قتل کی پاداش بدایوں کے ہی مقامی لوگوں کا قتل عام کرنا بعید از قیاس ہے۔

فیروز شاہ کے بعد تغلق خاندان کی حکومت زوال کی طرف بڑھنے لگی اور ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار رہا حتیٰ کے تیمور (r. 1370-1405) نے ہندوستان پر حملہ کیا اور حصول اقتدار کی چاہ میں بہت بڑا قتلِ عام کیا اور یہاں تباہی مچادی۔ تیمور کے حملے پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد مبشر نذیر لکھتے ہیں:

> وسط ایشیا میں تیمور (r. 771-807/1370-1405) ایک بڑی طاقت بن رہے تھے۔ تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب میں کھوپڑیوں کے مینار بناتے ہوئے دہلی اور میرٹھ تک آ پہنچے۔ یہاں آکر انہوں نے دہلی شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور لاکھوں کی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کیے بغیر واپس لوٹ گئے اور بقیہ عمر سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جنگوں میں بسر کی۔ محمود تغلق اپنے خاندان کے آخری بادشاہ ثابت ہوئے اور 817/1414 میں ان کی وفات کے ساتھ ہی تغلق خاندان کا اقتدار ختم ہو گیا۔[1]

تغلق خاندان کی حکومت کے بعد سادات اور پھر لودھی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ لودی سلطنت کے بادشاہ سکندر لودھی (r. 1489-1517) کے تعلقات اپنی ہندو رعایا سے زیادہ اچھے نہ

[1] مبشر نذیر۔ IH05۔ باب 3

رہے۔ سکندر اپنی سلطنت سے بت پرستی اور ہندومت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے پر اس نے ہندوؤں کی بعض مذہبی رسوم پر پابندی عائد کی۔ مثلاً کشتر کے تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہو کر اشنان کرتے تھے۔ سکندر لودھی نے چاہا کہ اس اجتماع کو روک دیا جائے، چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے ایک عالم دین مولانا عبد اللہ سے استفسار کیا تو انھوں نے سخت منع کرتے ہوئے فرمایا کہ غیر مسلموں کی قدیم رسم کا روکنا اور ان کے قدیم مندروں کو منہدم کرنا اسلامی شریعت میں بالکل جائز نہیں ہے۔[1]

مسلم علما کی مخالفت کے باوجود سکندر لودھی نے متھرا کے مندروں کو مسمار کر کے اس کی جگہ مساجد تعمیر کیں، جمنا میں نہانے پر پابندی عائد کی اور تمام حجام (Barbers) کو سختی سے حکم دیا کہ وہ کسی بھی کی چوٹی یا سر کے بال ان کے مذہب کے مطابق نہ بنائیں۔[2] بعد ازاں سکندر لودھی نے اس خواہش کی بناء پر ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کا حکم دیا کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی اہم عہدے پر فائز کرے۔

تغلق اور لودھی دونوں ہی خاندانوں میں دفاعی کمزوری زیادہ موجود تھی جس کی وجہ سے

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ **ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری**۔ جلد اول۔ صفحہ 114۔ عباد پبلیکیشنز۔ لاہور (2010)

[2] Iswari Prasad, ***A Short History of Muslim Rule in India,*** Ed. II, (Allahabad: Indian Press Ltd.)
p.223

چودھویں صدی کے وسط تک سلاطین دہلی کی حکومت دہلی اور اس کے گرد و نواح کے کچھ علاقوں تک ہی محدود رہ گئی اور دور دراز کے صوبے جن میں بنگال، دکن اور گجرات شامل تھے، خود مختار ہو گئے اور وہاں مقامی سلاطین کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اسی دور میں پرتگال کا مشہور جہاز ران واسکوڈے گاما کالی کٹ کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں پرتگالیوں نے گوا کے بندرگاہ سمیت اس پورے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ بقیہ ہندوستان میں مغلیہ اور دیگر سلطنتیں قائم رہیں۔

مغلیہ دور

مغلیہ سلطنت کی بنیاد 1526ء میں ظہیر الدین بابر (1526-1530CE) نے سلطنت دہلی کے آخری سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر رکھی۔ یہ سلطنت 1857ء تک برصغیر پر حکومت کرنے والی ایک مسلم سلطنت تھی۔ ہندوستان کے تخت و تاج پر بیٹھنے والے فاتح مغل حکمرانوں کی مذہبی رواداری تاریخ ہند کا ایک روشن باب ہے۔ ان بادشاہوں نے سرکاری مذہب اسلام ہی قرار دیا تھا مگر انھوں نے فراخ دلی اور فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عدل و رواداری پر مبنی وہی مذہبی پالیسی اختیار کی جو سلاطین دہلی کی روایت تھی۔ کسی بھی بادشاہ نے کبھی غیر مسلموں پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر و تشدد کی راہ اختیار نہیں کی اور نہ ہی کسی ہم مذہب کی بے جا حمایت میں آگے بڑھے، بلکہ ان کے نزدیک قانونی اعتبار سے ہندو مسلم سبھی برابر تھے۔

-

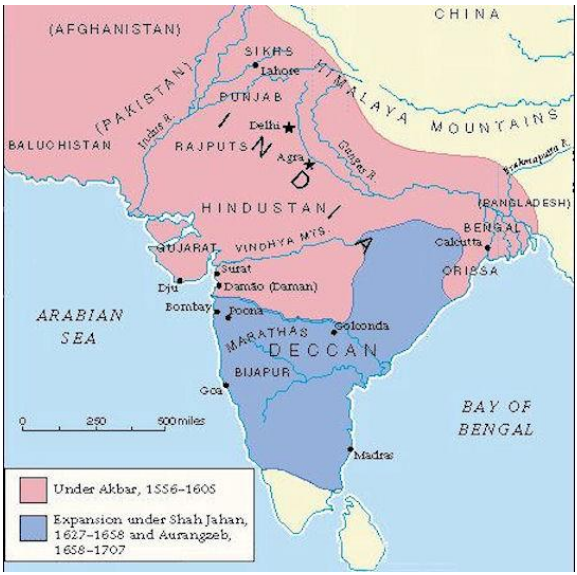

مغلیہ سلطنت 1556 تا 1606 عیسوی۔ سرخ رنگ میں اکبری عہد اور نیلے میں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں سلطنت کی وسعت ظاہر کی گئی ہے۔ بشکریہ:

http://www.globalsecurity.org

بابر اور ہمایوں کا عہد

بابر کو ہندوستان پر زیادہ عرصہ حکومت کرنے کا موقع نہ مل سکا اور اس کا انتقال ہو گیا' البتہ اس کم عرصے میں ہی ہمیں بابر کی طرف سے شاندار رواداری دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان آنے کے بعد بابر نے ہندو باشندوں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ اس کے نزدیک جس طرح مساجد کی حفاظت ضروری تھی اسی طرح وہ مندروں کی حفاظت کا بھی خیال رکھتا تھا۔ اس کی

سلطنت میں شیعہ، سنی، ہندو، جین سبھی اپنے مذہبی معالات میں آزاد و خود مختار تھے۔ بابر نے اپنی حکومت کی بنیاد رواداری کی جس عمدہ پالیسی پر رکھی تھی، مرض الموت میں اپنے بیٹے ہمایوں کو بھی یہی پالیسی جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس وصیت کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

> اے میرے بیٹے! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی۔ تم پر لازم ہے کہ اپنے دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹادو اور ہر گروہ کے مذہبی طریق کے مطابق انصاف قائم کرو۔ بالخصوص گائے کی قربانی سے احتراز کرنا، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکوگے پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی۔ جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس کی عبادت گاہوں اور مندروں کو نقصان نہ پہنچانا، عدل وانصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے بہتر ہے۔[1]

بابر ایک روشن خیال حکمراں تھا جس کی رحم دلی اور رواداری سب پر عیاں تھی۔ اس کی سوانح (تزک بابری) کے مطابق جب اس کی فوج بھیرہ سے گزر رہی تھی تو اس کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو بلا جواز تنگ کیا ہے، چنانچہ بابر نے فوراًان سپاہیوں کو گرفتار کرکے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا۔ اسی سوانح میں بابر کے وہ الفاظ بھی

[1] S.M. Jaffar, ***The Mughal Empire from Babar to Aurangzeb,*** (Peshawar: S Muhammad Sadiq khan Publisher, 1936) P.24

منقول ہیں جو اس نے گوالیار کے مندر کی سیر کرتے ہوئے اس کی تعریف میں کہے۔

اپنے باپ کی نصیحت نے ہمایوں کو بھی رواداری کا مظہر بنا دیا تھا'چتوڑ پر جب گجرات کے بہادر شاہ نے حملہ کیا تو مہاراجہ سانگا کی بیوہ رانی کرناوتی (پاکرمتی) نے ہمایوں کو راکھی بھیج کر اپنا راکھی بند بھائی بنالیا، ہمایوں اس وقت بنگال کی مہم پر تھا، اس نے فوراًبنگال کی مہم چھوڑ کر چتوڑ کا رخ کیا اور بہادر شاہ جو شکست دے کر یہ علاقہ رانی کے بیٹوں کے لیے محفوظ کر دیا۔[1] ہمایوں کے عہد میں سنسکرت کی کتب کا فارسی ترجمہ ہوا جن میں ہتوپدش کا ترجمہ مفرح القلوب اور امرت کنڈ کا ترجمہ بحر الحیات شامل ہے۔[2]

اکبری دور میں ہندوؤں سے اچھا سلوک

ہمایوں کی وفات کے بعد مغلیہ بادشاہ جلال الدین محمد اکبر (1605–1556 .r)13 برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کے مطالعے میں اکبر بادشاہ اور ان کا دور ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اکبر کے دور میں ہندو، بالخصوص ان کا مذہبی طبقہ کافی خوشحال رہا ہے۔ اکبر بادشاہ ایک ذہین سیاسی مدبر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی مختلف ریاستیں مل کر ایک جامع سلطنت بن جائے، مگر انھیں احساس تھا کہ ہندوؤں اور بالخصوص

[1] صباح الدین عبد الرحمٰن۔ جلد دوم۔ صفحہ 12

[2] ایضاً

عسکری قوم راجپوت کے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ ہندو ان کی رعایا میں اکثریت کے حامل تھے اور ہندو راجپوت ہندوستان میں آنے والے ہر حملہ آور کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ اکبر نے ان کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے لیے ان غیر مسلموں بالخصوص راجپوت خواتین سے ازدواجی رشتے قائم کیے جس کی وجہ سے اس پر ان کے مذہب کے گہرے اثرات اکبر کے خیالات پر پڑے۔

ہندوؤں پر ہونے والی زیادتیوں اور ماضی کی تلخیوں کو ختم کرکے بھلانے کے لیے اکبر نے ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ مراعات بھی دیں۔ اکبر نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ جس شخص نے بھی زبردستی اسلام قبول کیا ہے وہ دوبارہ اپنے مذہب کی طرف بلاخوف وخطر لوٹ سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ہندو رعایا کی وفاداریاں سمیٹنے کے لیے نہ صرف ہندوؤں پر عائد ہونے والے جزیہ کو ختم کیا بلکہ اپنی سلطنت میں بھی انھیں کو اعلیٰ عہدوں سے نوازا[1] اور اختیارات کے اعتبار سے انھیں تخت سلطنت کا شریک بنا دیا۔ اس کے علاوہ گائے کا ذبیحہ ناجائز اور حرام قرار دے دیا اور ہندوؤں کی خوشی کے لیے دیوالی، ہولی اور دیگر ہندوانہ رسوم میں بھی اکبر برابر شریک رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اکبر کی ذہنی و فکری حالت کا بہترین تجزیہ ہمیں اس رپورٹ میں ملتا ہے جو اکبر کے دربار میں طویل عرصے تک رہنے والے عیسائی مشنریوں نے گوا (Goa) میں اپنے

[1] Ganga Ram Gard, Edit, ***Encyclopedia of Hindu world***, (Delhi: Concept publishing house, 1991) p. 296

سربراہان کو بھیجی۔ اس رپورٹ کے کچھ حصے اکبر کی مذہبی حالت کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔

> بادشاہ مسلمان نہیں رہا ہے۔ لیکن وہ تمام مذاہب کے بارے میں تشکیک کا شکار ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ کوئی مذہب سچا الٰہی مذہب نہیں ہے کیونکہ ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہے کہ جو اس کی ذہانت اور عقل کے خلاف ہے۔۔۔
>
> عوام میں بھی بادشاہ کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ وہ نہ تو اسے عیسائی سمجھتے ہیں، نہ مشرک اور نہ ہی مسلمان اور یہ بات ہی درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ ہے تو مسلمان مگر ظاہری طور پر وہ تمام دوسرے مذاہب کو بھی مانتا ہے تاکہ عوام میں اس کی مقبولیت برقرار رہے۔[1]

اکبر نے کئی سنسکرت کتابوں کا اردو ترجمہ بھی کروایا۔ ستی کی ظالمانہ رسم کو ختم کروانے میں اگرچہ وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن یہ احکامات ضرور جاری کیے گئے کہ کسی بھی عورت کو زبردستی ستی نہ کیا جائے۔

درحقیقت ہم اکبر کو ایک لبرل یا سیکولر حکمراں کی حیثیت سے بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اکبر کی آزادانہ سوچ کا اندازہ نہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے افسران کی نگرانی میں سرکاری شراب خانے بھی کھلوائے اور باقاعدہ شراب کے نرخ بھی مقرر کیے گئے[2] بلکہ ایک

---

[1] مونیسراٹ، **اکبر کا ہندوستان**، مترجم: ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، سن اشاعت نامعلوم، ص 19

[2] کنور محمد اشرف، **ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں**، مترجم قمر الدین ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1989، ص 350۔

اور قدم آگے بڑھ کر عصمت فروش عورتوں کے لیے دہلی کے بیرونی علاقے میں جداگانہ رہائشی مکانات بھی تعمیر کرادیے تھے جہاں عصمت فروش خواتین کو رہنے کا حکم تھا، نیز ان سے جنسی تعلق قائم کرنے کے خواہش مند افراد کو مقررہ سرکاری افسر کے پاس اپنی جملہ تفصیلات بھی درج کرنی ہوتی تھیں۔[1] طوائف اور جنسی بازار کو ثقافت کا حصہ بنانے میں اکبر کا نمایاں کردار ہے۔ دراصل اکبر بادشاہ کی اس فکر کے پیچھے مذہب کے بجائے اس کی سیاسی حکمت کار فرما تھی جو اس کی کامیاب سیاست کا ضامن رہی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں ہنود

اکبر کے بیٹے جہانگیر (r. 1605-1627) کے بھی ہندوؤں کے ساتھ معاملات اچھے رہے تھے۔ راجپوت خاندان میں رشتہ داری کی وجہ سے اس کے تعلقات راجپوت راجاؤں اور امراء سے بھی خاصے اچھے تھے جو اس کی فوج اور دربار میں بھی کثرت سے شامل تھے۔ اس نے اپنے دور کے کئی ہندو شعرا و علما کی بھی سرپرستی کی۔ جہانگیر کی رواداری کے اظہار کے لیے محض یہ ثبوت ہی کافی ہے کہ اس نے اپنے محل کے اندر ایک مندر بنوا کر اس میں ہندو دیوتا ہنومان جی کی مورتی رکھوائی، یہ مندر غالباً جہانگیر کی ہندو ماں، بیویوں اور محل کی کنیزوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔[2]

---

[1] ایضاً۔ صفحہ 350

[2] صباح الدین عبدالرحمٰن۔ جلد دوم۔ صفحہ 125

اسی طرح شاہ جہاں کے دربار میں بھی ہندو کثرت سے ہوا کرتے تھے جن میں علما، شعرا اور منصب دار سبھی شامل تھے۔ اور شاہ جہاں کو بھی ان پر پورا بھروسہ تھا۔ جودھ پور کے مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور دربار کا بہت ہی معزز عہدے پر تھا حتیٰ کہ شاہ جہاں نے اسے عارضی طور پر دار السلطنت اکبر آباد کی حکومت بھی دی۔[1] شاہجہاں کی سرپرستی میں لکھی گئی تاریخ شاہ جہاں نامہ (بادشاہ نامہ) میں ایسے بہت سے راجپوت سرداروں کا نام ملتا ہے جو دربار میں انتہائی معزز تھے۔

شاہ جہاں کے دور میں ہندوؤں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ ہوئی لیکن ان پر بعض علاقوں میں نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی عائد تھی۔ یہ پابندی دراصل جہانگیر نے ہی عائد کی تھی جسے شاہجہاں نے بھی بدستور جاری رکھی۔ اس پابندی کی وجہ یہ ایک تو یہ تھی کہ مسلم قانون کے مطابق مسلمانوں کی خاص آبادی میں مندر کی تعمیر جائز نہیں۔ اس کے علاوہ اس پابندی کی ایک اور اہم وجہ اکبر کے بعد ہندوؤں کی قوت میں خاصا اضافہ تھا۔ بادشاہ جہانگیر کے ہی دور میں بعض علاقوں کے ہندو مسلمانوں پر مسلط ہو چکے تھے اور ان کی مساجد کو شہید کر کے جبراً بت خانوں میں تبدیل کر رہے تھے۔

شاہ جہاں نامہ ''اس بات کی شہادت دیتی ہے اس دور میں بنارس اور اس کے قرب و جوار کے

[1] صباح الدین عبدالرحمٰن۔ جلد دوم۔ صفحہ 154

علاقوں میں مسلم عورتوں سے جبراً شادی کرنا اور مسلمانوں کے بچوں کر زبردستی اپنے مذہب کی تعلیم دینا عام تھا حتیٰ کہ مسلمانوں کے لوٹے ہوئے مال سے مندر بھی بنائے جانے لگے تھے۔ چنانچہ ایسے حالات میں نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی عائد کرنا معقول حکم تھا جسے ہم مذہبی تعصب ہر محمول نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مخصوص مندروں کے انہدام پر ہندوؤں میں اس کے خلاف کوئی نفرت نہ پھیلی۔ مسلم عہد میں مندروں کا انہدام اسی طرح ہی تھا جیسے حالیہ دور میں ہندو انتہا پسند تنظیم BJP کی حکومت میں گجرات میں 80 مندر کو منہدم کر دیا گیا جو غیر قانونی تعمیرات کے زمرے میں آتے تھے۔[1]

اورنگ زیب عالمگیر اور ہنود

اورنگ زیب عالمگیر (r. 1656–1707) اکبر بادشاہ کے پر پوتے تھے۔ یہ تاریخ ہند کی وہ شخصیت ہیں جنہیں مورخین نے بت شکن، ہندو کش اور ظالم و جابر بادشاہ کی حیثیت سے متعارف و مشتہر کرایا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں عداوت اور خلیج پیدا کرنے کے لیے اس بادشاہ کے کردار کو خاص پر اجاگر کیا جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان کے متعلق کچھ تفصیل سے بحث کریں۔

اورنگ زیب کی نجی زندگی کے بارے میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب علم سنی مسلمان

[1] http://timesofindia.indiatimes.com/india/80-temples-demolished-in-Modis-capital/articleshow/3706244.cms (Nov 13, 2008)

تھے۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی زبان پر یکساں عبور تھا اور علم و فن کے دلدادہ تھے۔ اہل علم کی قدر کیا کرتے تھے البتہ درباری شعراء اور حکومت کی سرپرستی میں تاریخ لکھوانے کا رواج انھوں نے ختم کر دیا تھا۔ دین اسلام کے متعلق ان کی علمی خدمات کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ایک نیک اور متقی شخص تھے، انھوں نے نہ صرف خود شریعت کی پابندی کی بلکہ معاشرتی لحاظ سے کئی ضرر رساں رسوم کو بند کرانے میں بھی ان کے اقدامات قابل تحسین مانے جاتے ہیں۔ 1656 میں جب اورنگ زیب محی الدین کے لقب سے مغلیہ سلطنت کے تخت پر بیٹھے تو انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی فضول رسمیں ختم کیں اور فحاشی کا انسداد کیا۔ عالی شان محل، خوبصورت عمارتیں، حکومتی تعیشات اور مقبروں کی تعمیر و آرائش ممنوع قرار دی۔ شراب، افیون، نجوم، تہمات اور وہ تمام امور جو شریعت اسلامی کی رو سے حرام تھے ان پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بادشاہ کے آگے جھکنے کی ممانعت اور اسلامی طریقے سے اسے سلام کرنے کا رواج اورنگ زیب کے اخلاص کا واضح ثبوت ہے۔

بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کے دور میں ہندوؤں سے ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ ممکن ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہو کہ اورنگ زیب نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایسی رسومات ختم کروائیں جنہیں وہ غلط سمجھتے تھے۔ مثلاً انہوں نے مندروں میں ہونے والے خاص برہنہ رقص اور ستی کی رسم بھی جبراً ختم کروادی تھی اور بعض مندروں کے خزانوں کو ہندو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اورنگ زیب کی فوج اور سول ایڈمنسٹریشن میں ایک

بڑی تعداد ہندوؤں کی ملتی ہے، جو ان کے غیر متعصب ہونے کی دلیل ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں ہندو رہا کرتے تھے اور وہ اُن پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ چونکہ اورنگ زیب پر شیواجی کے معتقد مورخین کی جانب سے ہندوؤں پر مظالم کے بہت سارے الزامات لگائے جاتے ہیں اور یہ الزامات اس قدر کثرت سے لگائے گئے ہیں کہ عوام میں اسے اب سچ سمجھا جانے لگا ہے۔ جادوناتھ سرکار نے اپنی کتاب ہسٹی آف اورنگ زیب میں کئی الزامات لگائے ہیں جسے عصر حاضر کے بہت سے مورخین نے بھی انھیں بلا تحقیق نقل کر دیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ایک ایک الزام کا غیر جانبداری سے دلائل کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

یہاں ہم عالمگیر پر لگائے جانے والے الزامات کے متعلق تفصیل آپ مآثر عالمگیری اور علامہ شبلی نعمانی کی کتاب عالمگیر میں دیکھ سکتے ہیں۔

ہندوؤں سے جنگ

اورنگ زیب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جنگ و جدال میں گزرا ہے۔ یہ جنگ زیادہ تر غیر مسلموں اور بالخصوص ہندو راجاؤں سے تھی۔ اس بناء پر اورنگ زیب پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے وہ ایک ظالم و جابر حکمراں تھا جس کا مقصد ہندوؤں سے لڑ کر انھیں ختم کرنا تھا۔ اس لیے اس امر پر تحقیق کرنی چاہیے کہ آیا واقعی اورنگ زیب کا مقصد ہندوؤں سے لڑنا تھا؟

یہ درست ہے کہ اورنگ زیب نے مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں سے کئی جنگیں لڑیں، لیکن جب

ان جنگوں کا پس منظر دیکھتے ہیں تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ الزام بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اورنگ زیب نے ہندوؤں سے جو جنگیں لڑیں وہ ساری جنگیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ مختلف اقوام کی جانب سے ہونے والی شورشوں سے اپنی حکومت کو بچانے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے لڑی گئی۔ یہ جنگیں نہ ہندو مسلم جنگ تھی نہ سکھ مسلم، بلکہ یہ سیاسی جنگیں تھی جو مغل فرماں رواں اورنگ زیب اور ہندوستان کے دیگر حکمرانوں کے درمیان تھی۔ اس کے اہم شواہد حسب ذیل ہیں۔

1. مسلمان اس جنگ میں ایک قوم کی حیثیت سے کبھی شریک نہ ہوئے۔
2. کم و بیش سبھی جنگوں میں دونوں طرف ہندو اور مسلمان شامل تھے۔ شیواجی کے خلاف جنگ میں راجہ جے سنگھ بھی عالم گیر کی ہی طرف سے لڑنے گیا تھا۔ جبکہ شیواجی کی فوج کا جرنیل ایک مسلمان تھا۔
3. شیواجی کو اورنگ زیب کی قید سے آزاد کرانے والا ایک مسلمان ہی تھا۔
4. جنگ کے دوران اورنگ زیب عالم گیر کی فوج اور اس کی ایڈمنسٹریشن میں خود شیواجی کے کئی رشتہ دار و اعزاء بھی شامل تھے۔
5. ان جنگوں کو ہندوؤں نے بھی ہندو مسلم جنگ نہ سمجھا ورنہ سبھی ہندو اپنے جرنیلوں کا ساتھ دیتے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سکھ گرو کے خلاف جنگ میں اورنگ زیب کے مخالف مرہٹوں اور ان کے پیشوا شیواجی نے گرو کا کوئی ساتھ نہ دیا تھا اور نہ

ان کی حمایت کی۔ بلکہ گرو گوبند کو ہندو راجاؤں کے خلاف بھی اسی طرح جنگ کرنی پڑی جس طرح اورنگ زیب کے ساتھ جنگ ہوئی۔

6. اونگ زیب نے 1666ء میں سرحد کے شاعر اور جنگجو ہیرو خوشحال خان خٹک (d. 1689) کی شورش ختم کرنے کے لیے ان سے بھی جنگ کی جو کہ مسلمان تھے۔

اس پوری صورت حال پر غور کرنے سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ان جنگوں کو مذہبی رنگ دینا کسی بھی صورت ممکن نہیں۔ یہ معاملہ مذہب اور مذہبی جنگ کا کبھی نہ تھا بلکہ سیاست اور انتقامی معاملات سے متعلق تھا اور اس کے لیے نہ صرف ہندو راجاؤں سے بلکہ مسلمان بادشاہوں سے بھی جنگیں کیں جس میں فریقین میں دونوں ہی مذاہب کے پیروکار شامل تھے۔

ہندوؤں پر جزیہ لگانا

جزیہ ایک انتہائی معمولی سی رقم ہے جو ایک مسلم ریاست میں غیر مسلموں سے اس لیے وصول کی جاتی ہے۔ یہ رقم صرف تندرست، خوشحال، عاقل و بالغ اور آزاد مردوں سے وصول کی جاتی ہے جبکہ معذور، بوڑھے، بچے، بیوہ اور کمزور طبقہ اس سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اس ٹیکس کا مقصد یہ ہے کہ بوقت ضرورت غیر مسلموں کو جہادِ شرعی میں شریک ہونے سے استثنیٰ حاصل ہو اور ان کے مذہبی حقوق کی بھی پوری حفاظت کی جائے۔ جو غیر مسلم دفاعی امور میں شامل ہو وہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اکبر کے دور میں یہ جزیہ موقوف کر دیا گیا تھا، عالمگیر نے اسے دوبارہ

رائج کیا اور اس میں صرف ہنود نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی شامل تھے۔ نیز اورنگ زیب نے مسلمانوں کو بھی زکوۃ دینے کا پابند بنایا۔

ہندوؤں کو ملازمتوں سے نکالنا

متعصب مورخین اورنگ زیب پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ ان کے زمانے میں ہندوؤں کی تذلیل کی گئی اور اسی مقصد کے لیے انھیں حکومت کی ملازمتوں سے فارغ کر دیا گیا۔ حالانکہ تاریخ ایسے بے شمار راجپوت اور ہندو عہدیداروں کے نام سے بھری پڑی ہے جو اورنگ زیب کے دربار میں انتہائی معزز مقام رکھتے تھے اور کئی ہندو سپہ سالار اس کی طرف سے دوسرے ہندو اور مسلمان راجاؤں سے جنگ بھی لڑ چکے تھے۔ عالمگیری حکومت کے مشہور ہندو عہدیداروں میں راجہ اندر من دھندیرہ، راجہ انوپ سنگھ بھورتیہ، انی رائے، راجہ اندر سنگھ راٹھور، اسوجی دکھنی، راجہ اودت سنگھ، اودے سنگھ، راؤ بہاؤ سنگھ ہاڈا، وجے سنگھ، بکرم سنگھ گوالیاری، راجہ بھیم، رائے رایان تلوک چند اور کئی نام شامل ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو عالمگیر نے مختلف القابات و خطاب اور انعام و کرام سے بھی نوازا تھا۔

مندروں کو مسمار کرنا

اورنگ زیب نے صرف اُن منادر کو مسمار کیا جو ریاست سے بغاوت اور مذہبی جبر کا مرکز بن رہے تھے۔ نیز ان میں ایک وہ مندر بھی تھا جو نرسنگھ دیو نے لوٹے ہوئے ناجائز مال سے بنوایا تھا۔

بعض مندروں کو اس لیے مسمار کی گیا کہ وہ ہندو عوام کے ہی استحصال کا سبب بن رہے تھے۔ مثلاً وشواناتھ مندر کے انہدام کا قصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب بنگال جارہا تھا تو ورانسی کے پاس سے بھی گزرا ، اس کے جلوس میں ہندو راجے شامل بھی تھے۔ انھوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ سفر میں ایک روز یہیں قیام کیا جائے تا کہ ان کی رانیاں ورانسی جا کر گنگا میں اشنان اور وشواناتھ جی کی پوجا کرنے کی سعادت حاصل کریں۔ اورنگ زیب رواداری مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے لیے فوراً راضی ہو گیا۔ چنانچہ فوجی جلوس روک دیا گیا اور رانیاں پالکیوں سے روانہ ہوئیں۔ انھوں نے گنگا میں اشنان کیا اور وشواناتھ مندر میں پوجا کے لیے گئیں۔ سبھی رانیاں واپس آ گئیں مگر کچھ کی مہارانی لاپتہ تھی۔ اورنگ زیب کو اس کی گم شدگی کی اطلاع ہوئی تو بہت برہم ہوا، اس نے رانی کی تلاش کی تلاش شروع کروادی۔ مندر میں تلاش کرتے ہوئے گنیش دیوتا کی مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے سیڑھیاں تھیں جو ایک تہ خانے میں جاتی تھی۔ یہ تہ خانہ وشواناتھ مندر کے ٹھیک نیچے تھا۔

لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے رانی کو اس تہ خانے سے بازیاب کرایا مگر رانی کی عصمت دری ہو چکی تھی۔ اس خبر پر ہندو راجاؤں نے سخت احتجاج کیا، انھوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ وشواناتھ کی مورتی احترام کے ساتھ کہیں اور منتقل کر دی جائے اور مندر مسمار کر دیا جائے اور مہنت کو

گرفتار کر کے سزا دی جائے۔[1]

اورنگ زیب نے صرف مندر ہی نہیں بلکہ گولکنڈہ کی جامع مسجد کو بھی مسمار کیا۔ گولکنڈہ کے حکمراں تاناشاہ نے عوام کے کروڑوں روپے کے ٹیکس زمین میں چھپا کر اس پر جامع مسجد تعمیر کروادی تھی اورنگ زیب نے مسجد مسمار کروا کر خزانہ ضبط کرلیا اور رفاہ عام میں خرچ کیا۔ اس مثال سے واضح ہے کہ اورنگ زیب عوام الناس کے خلاف استعمال ہونے والے مندر اور مسجد کے انہدام میں کوئی تفریق نہ کرتا تھا۔

اگر اورنگ زیب کا مقصد ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا ہوتا تو دکن میں واقع بے شمار قدیم مندر بھی مسمار کر دیے جاتے جہاں وہ ان بغاوتوں سے نمٹ کر اپنے عہد میں 25 برس تک میں رہے۔ چنانچہ تاریخ اس بارے میں بالکل واضح ہے کہ جب عالمگیر ان شورشوں کو ان کے مرکز سمیت ختم دی تو اس کے بعد اس نے کسی بھی مندر کوئی بھی نقصان نہ پہنچایا۔ تاریخ میں ایسا کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ہے کہ انھوں نے ان مندروں کو بلاجواز کوئی ضرر پہنچایا ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اورنگ زیب نہ صرف ہندوؤں کے مندروں کا احترام کرتے تھے بلکہ فراخ دلی کے ساتھ مندروں کی مالی امداد واعانت بھی کیا کرتے تھے۔[2] چترا کوٹ (UP/India) میں اونگ زیب نے ایک بہت بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے اخراجات بھی حکومت کے ذمے

[1] صباح الدین عبدالرحمٰن۔ جلد سوم۔ صفحہ 315

[2] اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ۔ جلد 20۔ صفحہ 88۔ طبع اول، زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی، لاہور (1968)

لیے۔ انھوں نے اپنے تمام اہلکاروں کو اس بات کی تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ہندوؤں پر کسی قسم کا مذہبی جبر نہ کریں۔ ان کا ایک فرمان یوں ملتا ہے:

> یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوؤں کے پرانے مندر مسمار نہ کیے جائیں لیکن نئے مندروں کی تعمیر کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی۔ ہمیں یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کچھ اہلکار بنارس میں ہندوؤں کو ہراساں کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ برہمنوں کو بھی ہراساں کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اہلکار برہمنوں کو ان کے پرانے مندروں سے سبکدوش کرنے کی کاروائی بھی کرتے رہے ہیں حالانکہ یہ ان برہمنوں کا حق ہے کہ وہ اپنے پرانے مندروں کی سربراہی اور سرپرستی پر فائز رہیں۔ لہٰذا آپ کے لیے شاہی فرمان یہ ہے کہ آئندہ کوئی بھی اہلکار ان علاقوں میں غیر قانونی طور پر برہمنوں اور ہندوؤں کو ہراساں نہ کرے گا اور ان کے معاملات میں غیر قانونی مداخلت بھی نہیں کرے گا۔[1]

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی ہندو رعایا اور اُن کے مندروں کے لیے جو فرمان اور احکامات جاری کیے تھے ان کے پیش نظر یہ بات بالیقین کہی جاسکتی ہے کہ وہ نہ ہندو دشمن تھے اور نہ ہی مندر توڑنے والے کوئی بت شکن۔ اورنگ زیب سے ہندوؤں پر نئے مندر تعمیر کرنے کی پابندی ضرور عائد کی ہوئی تھی مگر یہ پابندی جہانگیر نے شروع کی تھی جسے شاہ جہاں نے بھی اپنے عہد میں برقرار رکھی۔ اپنے دورِ حکومت میں اورنگ زیب نے بھی ہندوؤں کو نئے مندروں کی تعمیر

[1] **مغلوں کا دورِ حکومت اور ان کا زوال۔** تلخیص و ترجمہ: محمد زاہد ملک۔ اضافہ جات: بابر جاوید۔ صفحہ 240۔ مشتاق بک کارنر، لاہور

کی اجازت نہ دی۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ جن مساجد کو مندروں میں تبدیل کیا جارہا ہے اس کی نگرانی کی جاسکے۔ انھوں نے بعض ہندو پاٹھ شالاؤں یعنی مدارس کو بھی اسی لیے بند کرادیا تھا کہ شاہ جہان کے آخری دور میں، اور بعد ازاں دارا شکوہ کے عہد میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر جبر شروع ہوگیا تھا، وہ مسلمان بچوں کو زبردستی اپنے مذہب کی تعلیم دینے لگے تھے جنھیں بند کرانا ضروری تھا۔ اگر ان کا مقصد ہندوؤں کے سبھی مدارس کو بند کرانا ہوتا تو ہندوستان بھر میں قائم سبھی مدارس بند کراتے، خود ان کے دار الحکومت میں سینکڑوں مدارس تھے جو سکون سے چل رہے تھے، مگر ہم دیکھتے ہیں یہ معاملہ صرف مخصوص مدارس کی ہی طرف سے ہوا۔ اورنگ زیب ایک راسخ العقیدہ مسلمان ضرور تھے، لیکن ان میں عملاً مذہبی تعصب قطعی نہیں تھا۔

ہندوؤں کے جلوسوں پر پابندی

محرم الحرام میں مسلمانوں کا ایک فرقہ تابوت و جلوس وغیرہ نکالتا ہے۔ 1079ھ میں برہان پور میں اس موقع پر دو گروہوں میں تصادم ہوگیا۔ یہ واقعات اکثر و بیشتر ہی ہوا کرتے تھے، اس لیے عالمگیر نے اس قسم کے تمام جلوسوں پر پابندی عائد کردی۔ ان کا حکم تھا کہ اس قسم کی مذہبی مراسم کو سرعام (Publicly) نہ کیا جائے۔ یہ حکم مسلم اور ہنود دونوں کے لیے ہی تھا۔

عالمگیر کے دیگر اصلاحی اقدامات[1]

- اورنگ زیب نے ستی کی ظالمانہ رسم کا مطلقاً پابندی عائد کر دی۔
- سنیاسیوں کو اپنی عبادت گاہوں کے علاوہ سڑکوں پر برہنہ گھومنے کی ممانعت کر دی گئی۔
- اورنگ زیب نے تاریخ نویسوں کو سرکاری سرپرستی سے آزاد کر دیا تھا تاکہ غیر جانبدارانہ انداز میں تاریخ لکھی جا سکے۔
- بادشاہ ہونے کے باوجود اورنگ زیب نے تمام شاہی تکلّفات کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ بادشاہ کے حضور زمین بوسی، بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانا، اور بادشاہ کی شان میں اشعار کہنے کا عہدہ ملک الشعراء بھی ختم کر دیا۔
- شاہی دربار میں جو رقص و سرور کی محفلیں رائج ہو چکی تھیں۔ اورنگ زیب نے اسے ختم کر دیا اور ان پیشوں سے وابستہ افراد کو مناسب پنشن دے کر فارغ کر دیا گیا۔
- 80 ناجائز ٹیکس کو ختم کیا۔ ان ٹیکسز میں وہ بھی شامل تھے جو گنگا اور جمنا میں نہانے پر وصول کیے جاتے تھے۔
- اسلام کے نام پر منایا جانے والا غیر اسلامی تہوار جشن نوروز بند کر دیا گیا۔

[1] یہ اصلاحات اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب، جلد 20، صفحہ 82 سے نقل کی گئی ہیں۔

- سکّوں سے کلمہ طیبہ کندہ کرانا بند کر دیا تا کہ کلمہ طیبہ کی بے حرمتی نہ ہو۔
- بیشتر سلاطینِ ہند نے اپنی حیثیت کو تقویت دینے کے لیے سکوں پر آیات و احادیث کندہ کروادی تھیں، اورنگ زیب نے اسے ختم کرایا۔
- مسلمانوں کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ زکوۃ کی ادائیگی لازماً کریں۔
- مسلمانوں کے اخلاق و اطوار کی اصلاح کے محکمہ احتساب قائم کیا۔
- غلاموں کی خرید و فروخت پر بھی پابندی عائد کی گئی۔
- بھنگ کی کاشت ممنوع قرار دی گئی۔

اس پوری تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر شدت پسند اور مذہبی جبر کا ہرگز قائل نہ تھے، بلکہ بعض متعصب انگریز اور ایرانی مورخین نے اپنی مذہبی تعصبات میں مبتلاء ہو کر ان کے کردار کو بری طرح بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ پروفیسر بشمبھر ناتھ پانڈے جو تاریخ پر کئی کتب کے مصنف بھی ہیں، ان کے مطابق اورنگ زیب کے متعلق ان مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کس تعصب اور واقعات محض ایک رخ کی تصویر پیش کی گئی ہے۔[1]

مسلم عہد حکومت کا مجموعی جائزہ

تاریخ اور دینیات کے طالب علم کے لیے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی

[1] http://www.cyberistan.org/islamic/pande.htm (20 Jan 2015)

حکومت کسی بھی طرح سے "اسلامی حکومت" نہ تھی، بلکہ اس میں ملوکیت کے غیر اسلامی عناصر شامل ہو چکے تھے۔ خلافت راشدہ جمہوری اقدار کی حامل اور خالص جمہوری بنیادوں پر ہی قائم ہوئی تھی جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تقریباً سبھی حکومت اس کے برخلاف تھی۔ برصغیر کے مسلم حکمرانوں کے ہاں سلطنت کے قیام کا انحصار محض طاقت پر تھا۔ جو حکمراں کسی دوسرے حکمراں کو خود سے کمزور محسوس کرتا وہ فوراً اس کے علاقے پر قبضہ کرلیتا تھا۔ اس استبداد کا تعلق خاص مسلمانوں سے ہی نہ تھا بلکہ اس زمانے میں سلطنت کے قیام کا یہی عالمگیر اصول تھا۔ علاوہ ازیں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی انتہائی سادگی اور قناعت پسندی میں گزری تھی جبکہ برصغیر میں بادشاہ کے انتخاب سے لے کر محلات کی تعمیر، حکومتی تعیشات اور دیگر فضول اخراجات قطعاً اسلامی تعلیمات کے منافی تھے۔ لہٰذا سلاطین ہند کو کسی بھی طور پر دین اسلام کا نمائندہ سمجھنا ایک بڑی غلطی ہوگی۔

یہاں مسلم سلاطین اور ان کے عہد کی مذہبی و اخلاقی حالت کا مختصر ذکر کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ مسلم سلاطین میں سے اکثر تصوف کے قائل تھے اور ان کی دینداری کا معیار بھی دراصل صوفیانہ رسوم و رواج مثلاً مزارات پر حاضری، نذر و نیاز اور صوفیاء کے ادب و احترام تک محدود تھی۔ ان میں سے اکثر سلاطین کی ذاتی زندگی عیش و عشرت کی تصویر تھی۔ ان کی خاص بیگم اگرچہ ایک ہی ہوتی تھی جس کے بچے تخت و تاج کے وارث بنتے تھے مگر جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنے حرم میں متعدد عورتیں شامل کر رکھیں تھیں۔ معزالدین کیقباد

-

(r. 1287–1290) شراب و شباب سمیت ہر طرح کی شہوت پرستی میں مبتلاء تھا، سلطان غیاث الدین شاہ خلجی (r. 1469-1500) نے گو کہ عورتوں کی فراہمی کے لیے مستقل شعبہ قائم کرر کھا تھا لیکن وہ ہمیشہ تاسف کرتا رہا اور اسی غم میں موت سے ہم کنار ہوا کہ اسے زندگی بھر اس کی پسند کی عورت نہ ملی۔[1] اس دور کے ہندو سلاطین کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا، جنوبی ہند کے ہندو راجاؤں کی انتہائی شہوت پرستی اور ان کی ہزار بیویوں اور غلاموں کا ذکر تقریباً سب غیر ملکی سیاحوں نے کیا ہے۔ اس ضمن میں مالوے کا راجہ کی مثال بھی ہے جس کے حرم میں دو ہزار عورتیں تھیں ان میں مسلم اور ہندو دونوں شامل تھیں۔[2] علاءالدین خلجی (r. 1296-1316) انتہائے تکبر میں پیغمبری کے خواب دیکھنے لگا تھا، اسی بادشاہ کے بارے میں ابن بطوطہ کی گواہی ہے کہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا تھا کہ اس کے دروازے پر کوئی شخص قتل نہ کیا گیا ہو۔ ان مقتولین میں اکثر بزرگان دین بھی ہوا کرتے تھے۔

اپنے مذہب میں ان بادشاہوں نے متعدد فرضی رسوم کی بنیاد دال دی تھی۔ نوروز کے ایرانی تہوار کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کرکے اسے مذہبی حیثیت دی گئی تھی۔ یہ تہوار موسیقی کے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ ایک اور اہم تہوار شب برأت تھا جو آج بھی برصغیر میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کے منائے جانے کا جواز کے متعلق اگرچہ علمائے اسلام کی

---

[1] کنور محمد اشرف۔ صفحہ 80۔

[2] کنور محمد اشرف۔ ایضاً

اکثریت کو شبہ رہا ہے لیکن اس تہوار میں ہندوؤں کے تہوار شوراتری کی نقل پر کسی کو اختلاف نہیں۔ اسی دور میں شب برات میں آتش بازی اور مکانات و مساجد میں چراغاں کرنے کا آغاز ہوا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق (1388-1351) ایک راسخ العقیدہ اور عادل بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے جو عیش و نشاط سے قدرے دور تھا مگر مذہبی حوالے اس کی وہ بھی تصوف، فال گیری اور بعض غیر شرعی امور کو خود پر لازم سمجھتا تھا۔ بالخصوص شب برات کی آمد پر آتش بازی اور پٹاخے بڑے پیمانے پر جمع کر لیا کرتا تھا جو کم از کم تیس گدھوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ نو مسلموں میں اپنے سابقہ مذاہب کے اثرات موجود تھے اور وہ ہر طرح سے اسے اسلام سے منسلک کرنے کے خواہش مند تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے جلد ہی ہندو دھرم اور ہندو رسوم و رواج کو اس حد تک سراہنا اور انھیں جذب کرنا شروع کر دیا تھا کہ تیمور نے اسی بات کو دہلی کی اسلامی حکومت پر حملہ آور ہونے کے لیے عذر بنالیا۔[1] مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب ہی تھے جنھوں نے سختی سے ہندوستان میں مروجہ اسلام کو غیر اقوام کے اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی۔

اکثر مسلم سلاطین کا مقصد زیادہ تر کشور کشائی اور خزانہ جمع کرنا ہی تھا۔ اورنگ زیب، فیروز شاہ اور ایک دو مُستثنیات کے سوا کسی بھی بادشاہ نے اسلام کی تبلیغ میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا، اور نہ ہی انھوں نے تبلیغی وفود بھیجے۔ بلکہ ان کی عیش پرستی اور مذموم حرکات نے اشاعت

[1] کنور محمد اشرف۔ ایضاً۔ صفحہ 62

اسلام کو ضرر پہنچایا جس کا مختصر حال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ لیکن معاشرے میں موجود مسلمان جن میں صوفیا، علما و محدثین اور عام لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اشاعت اسلام کا کام سرانجام دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے ہندو مسلمانوں کی معاشرت، تہذیب اور عادات واطوار سے قدرے متأثر ہوئے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جنوبی ہند میں فروغ اسلام کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جنوبی ہند مذہبی کشمکش کا شکار تھا۔ شیومت کے پیروکار بدھ مت اور جین مت کی شدید مخالفت اور اور ان کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ ان حالات میں اسلامی کے سماجی مساوات اور بھائی چارہ کا تصور ان کے سامنے آیا توہندو سماج کے ادنیٰ طبقہ کے افراد اس مذہب کو قبول کرنے لگے۔

جہاں تک ہنود سے تعلقات کا معاملہ ہے تو بعض حکمرانوں کے علاوہ ان بادشاہوں کی ذاتی زندگی سے قطع نظر ان کا رویہ ہنود کے ساتھ مذہبی رواداری اور حسن سلوک پر مبنی تھا۔ دہلی سلطنت اور مغلیہ سلطنت دونوں ہی میں ہنود اپنے حکمرانوں سے خوش رہے۔ ہندوستان میں ہزار سال حکومت کے بعد بھی ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد ہی دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ مجموعی طور پر ہندو مذہب کسی بھی قسم کے جبر سے محفوظ رہا اور یہاں اشاعت اسلام میں کبھی جبر کی راہ اختیار نہیں کی گئی۔ سلاطین ہند جانتے تھے کہ ان یہاں کی اکثریت یعنی ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں مداخلت نہ کرنا انھی کے سیاسی مفاد میں ہے جس کے بغیر ان کی حکومت زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ مسلم ہند کے دور میں بے شمار مندر تعمیر ہوئے۔ فیروز،

اورنگ زیب، التمش اور کچھ دوسرے بادشاہوں پر مندروں کے ڈھانے کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن ایسی حالت میں جب کہ ان سلاطین کی حکومت گجرات سے لے کر اڑیسہ تک پھیلی ہوئی ہو صرف مخصوص مندروں کو توڑنے پر اکتفا کرنا قابل غور ہے۔ اگر واقعی ان سلاطین کو ہندومت سے عناد ہوتا تو وہ اپنی سلطنت یا کم از کم دار الحکومت میں ایک بھی مندر کو نہ چھوڑتے۔ آگرہ، دہلی، متھرا اور کئی علاقوں میں مسلم عہد حکومت سے قبل تعمیر کیے گئے مندر اس دور میں بھی اپنی اسی شان کے ساتھ کھڑے رہے جس طرح ماضی میں تھے۔ ان بادشاہوں کی ساری زندگی میں صرف چند ایک مخصوص مندروں کی جانب قدم اٹھانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ بعض مندروں کے انہدام کا محرک مذہبی جنون نہیں بلکہ سیاسی استحکام تھا۔ یہ مخصوص مندر حکومت مخالفین کی دولت اور سازشوں کا مرکز بن چکے تھے جن کے خلاف کاروائی ناگزیر تھی۔ جبکہ دیگر مندروں کی تعمیر اور ان کے اخراجات میں میں ہندو رعایا کو مسلم بادشاہوں کا تعاون بھی حاصل تھا اور جنگ کے دوران توڑے گئے بہت سے منادر کی بعد میں دوبارہ تعمیر بھی کر دی گئی۔ ہندو اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی آزادی کے ساتھ کر سکتے تھے، حتیٰ کہ انھیں اپنے شہروں میں شراب اور خنزیر کے استعمال کی بھی اجازت تھی۔ ملکی قوانین کی بنیاد اگرچہ فقہ اسلامی تھا مگر ہندوؤں کے شخصی و مذہبی امور میں ان کے دھرم شاستروں کے ہی اصولوں کو رائج کیا گیا اور اس کے نفاذ کے لیے کئی مرکزی اور مقامی عدالتوں میں پنڈت موجود ہوتے تھے۔

مسلم حکمرانوں کے نزدیک ہندوؤں کی جان کی حرمت مسلمان کی ہی طرح تھی۔ مسلمانوں سے

زکوۃ اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا مگر عورتیں، معذور، بچے، غرباء اور بوڑھے افراد کو جزیہ کی ادائیگی سے استثناء حاصل تھا۔ اورنگ زیب سمیت کئی مسلم بادشاہوں کے دور حکومت میں غیر مسلموں کو بڑے اعزازات و مناصب بھی دیے گئے، گورنر، جنرل، وائسرائے اور کمانڈر انچیف جیسے قابل قدر عہدے ان کے سپرد کئے گئے۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی نے اپنی کتاب "ہندو امرائے سلطنت" میں کئی اہم غیر مسلم عہدیداروں کی اجمالی فہرست بنائی ہے جن میں سو سے زائد غیر مسلموں کے نام شامل ہیں۔ اسی طرح ہندو مسلم بادشاہوں کے سیاسی اتحاد بھی قائم ہوتے رہتے تھے، مثلاً علاءالدین خلجی (r. 1296-1316) نے جب جنوبی ہند کی تسخیر تو ان علاقوں کی فتوحات میں اسے ہندو راجاؤں کا بھی تعاون حاصل رہا۔ اکبر، جہانگیر، اورنگ زیب اور دیگر بادشاہوں سے متعلق تاریخ سے ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

باب 5: برطانوی قبضہ سے عصرِ حاضر تک

انگریزی دور میں ہندو اور مسلمان

سولہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ برطانیہ سے تجارت کی غرض سے برصغیر آنے والے انگریزوں مغلیہ سلطنت سے بعض مراعات حاصل کر کے مختلف شہروں میں اپنے مراکز قائم کر لیے۔ مسلمانوں کے زوال کو دیکھتے ہوئے یہاں انگریز سیاسی طور پر بھی سرگرم ہو گئے اور بنگال جو اس وقت فرنسیسیوں کے ہاتھ میں تھا، انہیں شکست دے کر یہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد مسلسل یکے بعد دیگرے تمام صوبوں پر ان کا قبضہ ہوتا رہا اور اس اقتدار کی توسیع ہوتی رہی حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک برصغیر کے مختلف راجاؤں، نوابوں اور حکمرانوں سے معرکہ آرائیوں کے بعد ان کا تسلط تقریباً پورے برصغیر پر قائم ہو گیا۔

انگریزی دور میں ہندوستان کی آزادی کے لیے ہونے والی جدوجہد ہندو مسلم تعامل کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ سولہویں صدی میں ہند میں قدم رکھنے والے برٹش اٹھارہویں صدی کم و بیش پورے ہند پر قبضہ کر چکے تھے۔ 1857 میں آخری مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دور میں انگریزوں کو دہلی کا اقتدار حاصل ہوا تو انھوں یہاں قتل و غارت مچادی۔ لاکھوں لوگوں کو بے

دریغ قتل کیا گیا، ان میں ہندو مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ جنگِ آزادی کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں کے مطابق چند روز کے اندر صرف دہلی میں 27 ہزار افراد شہید کیے گئے۔ شارع عام پر پھانسی کے تخت لگائے گئے جس پر سینکڑوں مسلم علما کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق پورے ہندوستان میں تقریباً 52 ہزار علما کو شہید کیا گیا۔ انگریزوں کی مچائی ہوئی اس ہولناکی کے خلاف مسلمان، ہندو اور متنوع مذاہب سے تعلق رکھنے والوں نے مشترکہ طور پر جہد وجہد کا آغاز کیا جس کی وجہ سے یہ دونوں قومیں آپس میں قریب ہوئیں۔ ایسے کئی مناظر دیکھنے میں آئے کہ ہندو مسلم دونوں نے ہی دوش بدوش انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔

انگریزوں کے اثرات

برطانوی استعمار کا اثر صرف تاریخ نویسی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نے ہندوستان کے علمی، سماجی اور مذہبی افکار پر بھی گہرے نقوش چھوڑے۔ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ، اصلاحِ مذہب اور سائنسی انقلاب کے نتیجے میں جن جدید افکار نے جنم لیا تھا، برطانوی اقتدار کے ذریعے وہ ہندوستان پہنچے۔ جدید تعلیم، انگریزی زبان، طباعت، اخبارات، عدالتی نظام، نئی جامعات اور مغربی علوم نے ہندوستانی معاشرے کو ایک نئے فکری دور سے روشناس کرایا۔ اس تبدیلی نے مذہبی فکر کو بھی متاثر کیا اور مختلف مذاہب کے علماء اور دانشور اپنے اپنے عقائد کی نئی تعبیر و تشریح پر آمادہ ہوئے۔

اس دور میں عیسائی مشنریوں، مستشرقین اور نو آبادیاتی اہلِ علم نے ہندوستانی مذاہب، تاریخ اور تہذیب کا وسیع مطالعہ کیا۔ بائبل، قرآن، وید، اپنشد، دھرم شاستروں اور دیگر مذہبی متون کے تراجم ہوئے، مناظرے منعقد ہوئے اور مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ فروغ پایا۔ اس کے نتیجے میں ہندو، مسلمان، سکھ اور دیگر مذہبی طبقات میں اصلاحی اور احیائی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ کی فکری روایت سے لے کر سر سید احمد خان، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور اہلِ حدیث کی تحریکوں نے جدید حالات کے مطابق مختلف علمی راستے اختیار کیے، جبکہ ہندو معاشرے میں برہمو سماج، آریہ سماج اور دیگر اصلاحی تحریکیں سامنے آئیں۔

جدیدیت کے اس دور نے مذہب کو صرف عبادات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک منظم سماجی اور سیاسی شناخت کی صورت بھی دی۔ اس سلسلے میں جیمز مل (James Mill) کی کتاب *History of British India* (1817ء) کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جیمز مل نے ہندوستان کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا: (1) قدیم ہند، جسے اس نے **ہندو عہد** قرار دیا؛ (2) عہدِ وسطیٰ، جسے **مسلم عہد** کا نام دیا؛ اور (3) جدید ہندوستان، جسے **برٹش انڈیا** قرار دیا۔ یہ صرف ایک مؤرخ کی ذاتی رائے نہ تھی بلکہ برطانوی حکومت نے اسی کتاب کو ہندوستان میں خدمات انجام دینے والے بہت سے سول عہدیداروں کی تعلیم و تربیت کا حصہ بنایا، اور بعد میں متعدد تعلیمی اداروں میں بھی یہی تقسیم رائج ہوئی۔ اس طرح یہ تصور حکمران طبقے، دانشوروں اور تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں راسخ ہوتا چلا گیا۔

اس تقسیم کے سماجی اور نفسیاتی اثرات نہایت گہرے تھے۔ قدیم ہندوستان کی پوری تاریخ کو "ہندوستان کی تاریخ" کے بجائے "ہندو تاریخ" کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ نتیجتاً ٹیکسلا، وادیٔ سندھ، موریہ، گپت اور جنوبی ہند کی عظیم علمی و تہذیبی روایات، جو درحقیقت برصغیر کے تمام باشندوں کا مشترک ورثہ تھیں، رفتہ رفتہ صرف ہندو تہذیب کا سرمایہ سمجھی جانے لگیں۔ دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اس قدیم ورثے کو اپنا مشترک تاریخی سرمایہ سمجھنے کے بجائے اس سے اجنبیت اختیار کر لی، حالانکہ یہ سرزمین کی مشترکہ تہذیبی میراث تھی۔

اسی طرح عہدِ وسطیٰ کو "مسلم عہد" قرار دینے سے ہندو ذہن میں یہ تصور پیدا ہوا کہ گویا ایک ہندو ہندوستان کو زبردستی ایک مسلم ہندوستان میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جبکہ مسلمانوں کے ایک طبقے نے پورے عہدِ وسطیٰ کو "اسلامی عہد" سمجھ کر ہر سیاسی تحریک، ہر فوجی مہم اور ہر سلطان کے اقدامات کو مذہبی رنگ دینا شروع کر دیا۔

آج کے مؤرخین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کو محض "ہندو"، "مسلم" اور "برطانوی" ادوار میں تقسیم کر دینا تاریخی حقیقت کو حد سے زیادہ سادہ بنا دیتا ہے۔ اس کے بجائے ضروری ہے کہ تاریخ کو اس کے سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی تناظر میں سمجھا جائے، تاکہ برصغیر کے مشترک ورثے کو کسی ایک مذہب یا ایک طبقے تک محدود نہ کیا جائے۔

تقسیم ہند

تقسیم ہند دراصل کم و بیش تین دہائیوں پر محیط اس جدوجہد کا پیش خیمہ تھی جو برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی بقاء کے لیے شروع کی گئی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں قوت اور غلبہ کے اعتبار سے برصغیر میں خاصی تبدیلی واقع ہوچکی تھی۔ مسلمان جو ہزار سال سے زائد عرصہ تک یہاں غالب تھے، اب مغلوب ہوچکے تھے۔ عصری تعلیم کے اعتبار سے مسلمان پیچھے تھے اور ہندو اسی تعلیم کی بنیاد پر سیاسی و انتظامی ڈھانچے میں جونئیر شریک کار کی حیثیت حاصل کرچکے تھے۔

اسی زمانے میں ہندوؤں کے دو احیائی تحریکوں نے جنم لیا جو "شدھی" اور "سنگھ ٹن" کہلاتی تھیں۔ شدھی کا مقصد یہ تھا کہ ہندو مذہبی دعوت دوسری قوموں بالخصوص مسلمانوں میں پھیلائی جائے۔ سنگھ ٹن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو عسکری تربیت دے کر انہیں منظم کیا جائے۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مخاصمت کی فضا پروان چڑھی اور اس کا نقطہ عروج 1356/1937 کے انتخابات تھے، جن میں ہندوؤں کو وزارتیں بنانے کا موقع ملا۔ مسلمانوں میں اس سے ایک جوابی تحریک پیدا ہوئی، بالخصوص اِن انتہاء پسند ہندوؤں کے طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی عددی کمتری کے پیش نظر کئی خدشات لاحق تھے، حتیٰ کہ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے سفیر محمد علی جناح نے بھی اس بات کو محسوس کرلیا کہ انگریزوں

کے جانے کے بعد برصغیر کی زمامِ اقتدار فطری طور پر ہندوؤں کے ہاتھ آجائے گی جس سے مسلمانوں کو کئی علاقوں میں اکثریت ہونے کے باجود اقلیت کا مطیع ہونا پڑے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ نے اپنے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ اس مطالبے میں ہندوستان کے سبھی مسلمان ان کے ساتھ شریک نہ تھے، لیکن مسلم اکثریتی صوبوں کو اپنا مستقبل نئے وطن کی صورت میں ہی نظر آرہا تھا۔ محمد علی جناح کی سربراہی میں ایک طویل سیاسی جدوجہد کے بعد 14 اور 15 اگست 1947ء کو بالترتیب پاکستان اور بھارت کا قیام عمل میں آیا جسے تقسیم ہند کہا جاتا ہے۔

اہل پاکستان کی اکثریت کا یہ ماننا ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جو مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کی حفاظت اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا ہے۔ جبکہ بھارت میں بالعموم سرکاری موقف یہی رہا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کوئی تنازع نہ تھا بلکہ انگریز سازش کرکے ہندوستان کو تقسیم کرکے چلے گئے۔ اس حوالے سے غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو تاریخ کا کوئی سنجیدہ طالب علم اس بات سے ناواقف نہیں کہ اُس دور میں موجود حکومت میں ہندو اور انگریز قیادت نے ایسے تمام حالات پیدا کردیے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم ناگزیر تھی۔ تقسیم ہند کو غلطی قرار دینا بذات خود ایک عظیم غلطی ہوگی کیونکہ یہ تقسیم ہر اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ضروری اور بہترین حل تھا۔ برطانوی سامراج کے اختتام کے وقت ہندو برصغیر میں نہ صرف اکثریت میں تھے بلکہ اقتدار و معاملات پر غالب بھی تھے، ایسے حالات

میں مسلم اقلیت کو محسوس ہونے والے خطرات کو بے بنیاد اور تخیل کی پیداوار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اس بات سے بھی منہ نہیں چھپایا جاسکتا کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ دعوتی تعلق کو کسی حد تک نقصان پہنچا ہے۔

موجودہ صورت حال

موجودہ دور میں دنیا کے بہت سے ممالک میں ہندو اور مسلمان ساتھ رہتے ہیں۔ ان میں نیپال، افغانستان، امریکہ، چین، افریقہ، ملائیشیا اور کئی مغربی ممالک ہیں۔ ملائیشیا میں کچھ عرصہ ہندوؤں کے حقوق، بالخصوص ہندو مندروں کے حوالے سے صورتحال کچھ نامناسب رہی، کئی مندر مافیا اور حکومت کی سرپرستی میں منہدم کر دیے گئے جس پر وہاں کی ہندو برادری سراپا احتجاج بنی رہی۔ لیکن بعد میں صورت حال بہتری کی جانب گامزن ہوئی۔ چونکہ ان دونوں مذاہب کی بڑی آبادی ہندوستان اور پاکستان میں رہتی ہے اس لیے ہم ان دو خطوں کا تذکرہ خاص طور پر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان

متنوع مذاہب کی آماج گاہ بھارت ایک سیکولر مملکت ہے جہاں ہندو مسلم اور دیگر اقوام شانہ بشانہ ساتھ رہتی ہیں۔ مسلمان یہاں ہندوؤں کے بعد دوسری بڑی قوم ہے جو اپنے آزادی سے

رہتی ہے۔ مذہبی اعتبار سے بھی مسلمانوں کو آزادی حاصل ہے، انھیں اپنی مساجد و مدارس تعمیر کرنے کی بھی اجازت حاصل ہے، اسلامی کتب و جرائد کی اشاعت اور مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماع بھی جاری ہیں۔ عوامی سطح پر ہندو مسلم اتحاد کی بے شمار مثالیں اب بھی موجود ہیں؛ مگر تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی مسائل نے اسے کافی نقصان پہنچایا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سب سے اہم مسئلہ ہندو انتہاء پسند تنظیمیں ہیں۔ ایک زمانے سے ہندو انتہا پسند تنظیموں کی طرف سے مسلمان شدید مذہبی تعصب کا شکار ہیں۔ ان متشدد ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد اس سرزمین کو ہندو دیش اور آریہ ورت مانتی ہے جس کا مذہب ہندومت کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی قدیم ہندوانہ تہذیب و ثقافت اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی فکر کو "ہندوتو" کہا جاتا ہے۔ بھارت میں کئی انتہا پسند تنظیمیں اس مقصد کے حصول کے لیے فسادات، قتل عام اور دیگر کوششیں کر چکی ہیں۔ یہ کوششیں اس وقت مزید عروج حاصل کر لیتی ہیں جب کوئی ہندو انتہا پسند تنظیم کو اقتدار مل جائے۔ حال ہی میں 2014 کے آخر میں ہندو انتہا پسند تنظیم راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ (RSS) اور ان کی شریک کار دوسری ہندو تنظیموں نے "گھر واپسی" کے نام سے ایک تحریک شروع کی جس کے تحت مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنا کر ان کے آبائی مذہب میں واپس لوٹایا گیا۔ سرکاری پشت پناہی میں چلنے والی اس تحریک میں ہزاروں مسلمان اور عیسائیوں کو زبردستی ہندو بنایا گیا۔ اسی طرح مسلمانوں پر ہندی گیت وندے ماترم، جو کہ مذہب اسلام کی تعلیمات سے ٹکراتا ہے، پڑھنے کا

اصرار برسوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ اسکولوں کے نصاب میں، مسلم فاتحین کے خلاف تعصبانہ تاریخ اور ہندو مذہب کی ترویج لیے بھی کئی مضامین شامل کئے گئے ہیں، حتیٰ کہ بھگود گیتا کو نصاب میں شامل کرنے پر بھی کئی بار قانون سازی کی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فسادات ہونا اب معمول کی بات ہے جس میں بے شمار جانوں کا ضیاع ہوتا ہے اور اس میں مسلمانوں کی جانی نقصان اس قدر ہوتا ہے کہ یہ مقولہ مشہور ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کی قربانی جائز ہے۔

اگرچہ ہندوستان کا آئین سیکولر ازم، مذہبی آزادی اور تمام شہریوں کی مساوات کی ضمانت دیتا ہے، لیکن گزشتہ چند دہائیوں میں بالخصوص 2014 میں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہندوتوا کی سیاست اور ہندو قوم پرستانہ نظریات کو پہلے کی نسبت زیادہ سیاسی اور سماجی تقویت ملی ہے۔ متعدد مبصرین، صحافیوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق اس دور میں مذہبی شناخت، تاریخ نویسی، تعلیمی نصاب اور قومی تشخص سے متعلق مباحث میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ بابری مسجد، شہریت ترمیمی قانون (CAA)، گاؤ رکھشا کے نام پر ہجوم کے تشدد (Mob Lynching)، مذہبی تبدیلی سے متعلق قوانین اور بعض نصابی تبدیلیوں جیسے معاملات نے ہندو مسلم تعلقات کو مزید حساس بنا دیا۔ حکومت اور اس کے حامی ان اقدامات کو قومی مفاد، ثقافتی احیاء اور قانونی اصلاحات قرار دیتے ہیں، جبکہ ناقدین کے نزدیک ان پالیسیوں نے اقلیتوں، خصوصاً مسلمانوں، میں عدم تحفظ کے احساس کو بڑھایا ہے۔ اس سیاسی

ماحول نے ہندو انتہا پسند تنظیموں کے بیانیے کو بھی تقویت دی، جس کے اثرات سماجی تعلقات، ذرائع ابلاغ اور مذہبی ہم آہنگی پر نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اگر ہم اس عارضی صورت حال کو نظر انداز کر دیں تو یہ درست ہے کہ ماضی میں بحیثیت ایک قوم بھارت میں مسلمانوں کو تعصب سے جنم لینے والے مسائل کا سامنا ہے، مگر ان کا تعلق زیادہ تر اربابِ سیاست اور انتظامی امور سے ہے جس ذکر ہم کر چکے ہیں۔ معاشی و اقتصادی لحاظ سے بھی مسلمانوں کی حالت قدرے بہتر یا مقامی ہندوؤں کے مساوی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ عددی تناسب سے کم ہے مگر اس کی بنیادی وجہ تعلیمی و معاشرتی میدان میں ہندوؤں کی سبقت اور سیاسی جماعتوں کا قبضہ ہے، اس حوالے سے یہ مسئلہ خاص مسلمانوں کا نہیں بلکہ عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ صحافت و قیادت کے میدان میں اکثریت نے مسلمانوں کے اندر خطرہ کی نفسیات (Fear-psychosis) پیدا کر کے پوری قوم کو ایک مظلومیت اور عدم تحفظ کی نفسیات میں مبتلا کر دیا ہے۔ مسلم قیادت کی اکثریت کے غیر معقول رویے نے بھی مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ عبرت کے لیے کافی ہے۔ اب وقت اس بات کا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اپنی اقلیتی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اپنے طریق عمل کو بدلیں۔ ریاست سے احتجاج و شکایت کی بجائے صبر و تحمل کے ساتھ اشاعت اسلام کے جذبے سے سرشار ہو کر تمام تر قوت اپنی تعلیم و تربیت اور دعوتِ دین پر صرف کریں اور سیاست کے میدان کے بجائے غیر مسلم اقوام کے دلوں کو مسخر کرنے کی فکر کریں۔

پاکستان میں ہنود

مسلم اکثریتی ملک پاکستان بھی فرقہ واریت اور مذہب کے جھگڑوں سے پاک نہیں ہو سکا ہے مگر یہاں دونوں قوموں کے درمیان تناؤ کافی کم ہے اور یہاں ہندوؤں کو جن مسائل کا سامنا ہے اس کی وجہ مذہبی تعصب کی بجائے انتظامی نااہلی ہے۔ یہاں ہندوؤں کی آبادی تقریباً 30 لاکھ ہے جو زیادہ تر صوبہ سندھ اور بھارتی ریاست سے متصل شہر تھرپارکر میں ہے۔ پاکستان میں مسئلہ ہندو مسلم نہیں بلکہ مسلم اور غیر مسلم اقلیت ہے۔ پاکستان میں بسنے والے ہندوؤں کو عام طور پر انھی ایک مسائل کا سامنا ہے جو ملک کی دوسری اقلیتوں کو ہے۔ اس وقت جو اہم مسائل درپیش ہیں ان میں سب سے اہم مسئلہ توہین رسالت کے نام پر جھوٹے مقدمات کا سامنا کرنا ہے۔ آئے دن ایسے بے شمار واقعات سامنے آتے ہیں جس میں ذاتی بغض و عناد کا انتقام لینے کے لیے مذہب کا غلط استعمال کرتے ہوئے اقلیتوں پر توہینِ رسالت کے نام پر جھوٹے مقدمات دائر کر دیے جاتے ہیں اور لوگوں میں اشتعال پھیلا کر انھیں خود ہی سزا دے دی جاتی ہے۔ پاکستان میں توہین مذہب اور توہین رسالت کے الزامات کے بعد اس طرح کے واقعات اب ایک معمول بن چکے ہیں، جن میں زیادہ تر اقلیتوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہندوؤں میں موجود ذات پات کا مسئلہ بھی ان کے مسائل میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ ذات پات میں منقسم ہونے کی وجہ سے پاکستانی ہندو نہ صرف سیاسی طور پر بھی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ یہ نظام ان کے لیے تبدیلی مذہب کی راہ بھی کھول رہا

ہے۔ نچلی ذات کے ہندوؤں میں معاشرے میں یکساں مقام حاصل کرنے کے لیے تبدیلئ مذہب کا عمل جاری ہے اور انہوں نے اسلام یا مسیحیت اختیار کر لیا ہے۔ تبدیلئ مذہب کا یہ عمل گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے اور اب تک ہزاروں خاندانوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے۔ اسی وجہ سے 1947ء میں تقسیم کے وقت پاکستان میں ہندوؤں کا جو تناسب 15 سے 20 فیصد تک تھا اب محض 2 فی صد رہ گیا ہے۔ تبدیلی مذہب کے علاوہ اس کمی کی ایک اور وجہ بڑے پیمانے پر ہجرت بھی ہے۔

پاکستان میں ہندوؤں کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ مندروں کا تحفظ ہے۔ تاہم یہ مسئلہ مذہبی نہیں بلکہ انتظامی ہے۔ حکومت کی عدم توجہی کے باعث ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہوں کی حالتِ زار انتہائی خراب ہے۔ ان منادر کو نہ ہی حکومتی سرپرستی حاصل ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تحفظ۔ نوّے کی دہائی کے اوائل میں ہندوستان میں بھارتی مسجد کی شہادت کے بعد رد عمل کے طور پر پاکستان میں بھی بعض انتہا پسند مسلمانوں نے بڑی تعداد میں مندروں کو مسمار اور نذر آتش کیا گیا۔ مارچ 2014 میں سندھ کے شہر لاڑکانہ میں ایک ہندو شخص نشے کی حالت میں جب قرآن مجید کے مقدس اوراق کی مبینہ طور پر بے حرمتی کی تو اس کے رد عمل میں مشتعل افراد نے علاقے میں واقع مندر سے متصل دھرم شالا کو بھی آگ لگا دی گئی، جس کے نتیجے میں دھرم شالہ جزوی طور پر جل گیا۔ اس کے بعد بھی کئی بار ہندو شدت پسندوں کی جانب سے مندروں پر اس قسم کے حملے ہوتے رہے ہیں جس میں زیادہ تر حملے کسی رد عمل کے طور پر ہوئے ہیں جس کے

خلاف مسلم کمیونٹی نے بھی ہندوؤں کے شانہ بشانہ احتجاج کیے۔

معاشرتی اعتبار سے پاکستان میں ہندوؤں کے لیے وہ تمام تعلیمی مواقع میسر ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اعلیٰ عدالتوں میں جج سے لے کر ڈاکٹر اور دیگر ممتاز اداروں میں ہندوؤں کی مناسب شرح موجود ہے ۔ حتیٰ کہ صوبہ سندھ میں ہندوؤں کے لیے ان کی مذہبی تعلیم کا انتظام بھی صوبائی حکومت کی سرپرستی میں کیا جاتا ہے۔ تاہم مسلم اکثریت ہونے کے ناطے بہر حال کچھ مسائل موجود ہیں۔

اس وقت مسلم علما کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں میں یہ شعور پیدا کریں کہ توہینِ مذہب یا کسی ایسے واقعے کے رد عمل میں اقلیتوں کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانا تعلیماتِ نبوی کے خلاف اور سراسر گناہ ہے۔ حکومت کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بغیر کسی سیاسی مفاد کے تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والی عبادت گاہیں اور تاریخی عمارتوں کو ثقافتی ورثہ سمجھتے ہوئے ان کا تحفظ یقینی بنائیں اور ہندوؤں کے مذہبی و معاشرتی تحفظ کے لیے ہندوستان کے مسلم پرسنل لاء کی طرح پاکستان میں بھی ہندو فیملی لاء کی تشکیل دے۔ علاوہ ازیں ہندو مسلم اتحاد کے فروغ کے لیے نصابی کتب نظر ثانی کرنا انتہائی ضروری ہے۔

-

حصہ دوم:

ہندومت اور اسلام کا تعلق

باب 6: ہندوؤں کے بارے میں اسلام کا موقف

اسلام اور ہندومت دو عظیم اور مختلف نوعیت کی تہذیب کی نمائندگی کرنے والے مذہب ہیں۔ برصغیر میں یہ دو تہذیبیں کم و بیش ایک ہزار سے زائد عرصے سے موجود ہیں۔ ان کے باہمی تعلق کے بارے میں ہمارے سامنے موجودہ دور میں علمائے ادیان کی جانب سے پیش کی جانے والی دو آراء موجود ہیں۔ ایک رائے کے مطابق یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ وحدت ادیان کے قائل حضرات اسی قسم کے بات ہمیشہ سے پیش کرتے آئے ہیں کہ یہ ان دونوں مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ اسلام اور ہندومت دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ان کا باہم کوئی تعلق ہے نہ رشتہ، اور یہ ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے کے مقابل برسرپیکار رہے ہیں۔

فی الواقع یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ہندومت اور اسلام ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، کیونکہ اپنی نظریاتی اساس میں اسلام اور ہندومت کی موجودہ صورت باہم ایک دوسرے سے متضاد ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو متونِ مقدسہ میں آج بھی ایسی تعلیمات موجود ہیں جو اسلامی تعلیمات سے قریب تر ہیں اور انھیں بنیاد بنا کر باہمی ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

ہندوؤں کے لیے پیغمبر بھیجے گئے؟

قرآن مجید میں یہ بات صراحت سے بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی دور میں کسی بھی قوم کو انبیائے کرام کی تعلیمات سے محروم نہیں رکھا، بلکہ اس نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجا ہے اور اپنا پیغام سنا دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی کہ جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔ (سورۃ الفاطر: آیت 24)

ان آیات کے علاوہ منطقی اور اصولی طور پر بھی یہ بات اللہ کی حاکمیت اور ربوبیت کے خلاف ہے کہ وہ روئے زمین پر بسنے والی کسی بھی امت، قوم، فرقے حتیٰ کہ کسی ایک فرد کو بھی بغیر ہدایت کی راہ دکھائے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے اور خیر و شر سے آگاہ کیے بغیر روزِ محشر اس سے اس کا حساب لے۔ اللہ کا فرمان ہے:

اور آپ کا پروردگار کسی بستی کو ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب تک اس کے مرکز میں کوئی رسول نہ بھیج دے جو ان کے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کرے اور ہم کسی بستی کے تباہ کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ اس کے رہنے والے ظالم ہوں۔ (سورۃ القصص: آیت 59)

اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو بھیجا، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان فرما دیا اور ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان نہیں فرمایا۔ (سورۃ غافر: آیت 78)

-

تمام رسول اپنی قوم کی زبان ہی بولتے تھے (ابراہیم 4:14)

آخر الذکر آیت کے مطابق مشرق و مغرب کی تمام اقوام عالم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ضرور بھیجے ہیں جو اپنی اپنی زبان میں تبلیغِ حق کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتائے گئے ہیں اور بعض نام نہیں بتائے گئے۔ لہٰذا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل میں انبیاء بھیجے گئے اسی طرح وہ قوم جس کی تاریخ یہود سے بھی زیادہ قدیم ہے ان میں بھی کوئی پیغمبر بھیجا گیا ہو گا۔ سرزمینِ ہند اور اس کی تہذیب بھی یقیناً نورِ ہدایت سے منور ہوئی۔

کیا ہندو اہل کتاب ہیں؟

جب شواہد اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہوں کہ ہندوستانی قوم کو بھی ہدایت دی گئی اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کہ ان کی مقدس کتابیں بھی بعض الہامی تعلیمات کی حامل ہیں، تو یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ کیا ہندو اہل کتاب ہیں؟ اس کے لیے ہمیں سب سے اہل کتاب کی اصطلاح کو سمجھ لینا چاہیے۔

اہل کتاب سے مراد قرآنی اصطلاح میں وہ لوگ ہیں جن کا کتابُ اللہ سے (جن کا ذکر قرآن میں ہے) اور اپنے انبیاء کرام علیہم السلام سے واضح طور پر رشتہ قائم ہو، اور وہ ان کی کتاب لانے والے نبی کو بھی مانتے ہوں۔ اس تعریف کے پیش نظر ہنود کو علمائے اسلام نے اہل کتاب میں

شمار نہیں کیا ہے، بلکہ انہیں شبہ اہل کتاب کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ محققِ اسلام سید سلیمان ندوی سیرت النبی میں لکھتے ہیں:

> **شبہ اہل کتاب**۔۔۔یعنی وہ لوگ جو قرآن اور تورات اور انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود کو اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابئی جو ایک آسمانی کتاب کے دعویٰ کے باجود ستاروں کو پوجتے تھے۔ اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں' ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہیں پر قیاس کرکے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صف میں داخل کیا۔[1]

ہندومت اور اس نوعیت کے دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لیے ایک اصطلاح صائبین قرآن مجید میں مستعمل ہے۔ مولانا ادریس کاندہلوی نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں ہنود کو صائبین میں ہی شمار کیا ہے۔ ہندوؤں کے متعلق علمائے اسلام نے یہ حکم رکھا ہے کہ ان کا ذبیحہ اور عورتوں سے نکاح حرام ہے البتہ ان سے میل جول کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ چنانچہ ہنود سے معاملات کرتے ہوئے اور انہیں دعوت دیتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

---

[1] علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی۔ **سیرت النبی**۔ پاکستان۔ ادارہ اسلامیات، جلد چہارم، صفحہ 356 (تصحیح شدہ جدید ایڈیشن 2002)

-

ہندو مقدس شخصیات کے بارے میں اسلام کا موقف

یہ سوال تقابل ادیان کے طلباء کے لیے کافی اہمیت رکھتا ہے کہ ہندوؤں کی مقدس شخصیات مثلاً رام و کرشن کے بارے میں اسلام کا کیا موقف ہے۔ اسلام ان شخصیات کو احترام و تقدس کے سائے میں رکھتا ہے یا دیگر مذاہب کی طرح غیر مذاہب کی مقدس شخصیات کو طعن و تشنیع کے قابل قرار دیتا ہے؟

اس سوال کے جواب سے قبل وہ اصولی بات دہرا لینی چاہیے جو ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ قرآن مجید میں دنیا کی ہر قوم کی ہدایت کے لیے انبیاء بھیجے گئے۔ قرآن مجید یہ منفرد تصور اس بات کو ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ ہندوستان میں بھی اللہ کے پیغمبر آئے۔ یہ پیغمبر کون تھے؟ اس بارے میں ہمارے پاس تصدیق کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے تاہم اتنا معلوم ہے کہ بہت سے پیغمبر ایسے ہیں جن کے نام نہیں بتائے گئے۔ برصغیر کے جمہور علما کا یہی ماننا ہے کہ سورۃ الغافر کی آیت کریمہ کے مصداق ہندوؤں کی مقدس شخصیات میں سے ممکن ہے کہ بعض پیغمبر ہوں۔ لیکن ہندو قوم نے دیومالائیت اور اساطیریت میں ان کی اصل شخصیتوں کو مسخ کر دیا ہو۔ برصغیر کے مشہور متکلم اسلام مولانا قاسم نانوتوی بھی ہنود کی مقدس ہستیوں کو امکانی طور پر نبی اور ولی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی سوانح عمری میں ان سے منقول ہے کہ:

کیا عجب ہے کہ انبیاء ہندوستان بھی انھی نبیوں میں سے ہوں جن کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

سے نہیں کیا گیا۔۔۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دعویٰ خدائی نصاریٰ نے منسوب کر دیا ہے اور دلائل عقلی و نقلی اس کے مخالف ہیں' ایسے ہی کیا عجب ہے کہ شری کرشن اور شری رام چندر کی طرف بھی یہ دعویٰ (خدائی وغیرہ کا) بدروغ منسوب کر دیا گیا ہو۔۔۔ کیا عجب ہے کہ شری کرشن و شری رام چندر بھی ان عیوبِ مذکورہ سے مبّرا ہوں اوروں نے ان کے ذمے یہ تہمت (زنا و سرقہ) لگادی ہو۔۔۔[1]

قرآن مجید ہر مسلمان کو اس انتہائی اہم اصول کا پابند کرتا ہے کہ ممکن ہے یہ پیغمبر ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ ہو، تاہم ان ہستیوں کے سلسلے میں کوئی گستاخانہ رویہ اختیار کرنا کسی بھی طرح درست نہیں۔

[1] مولانا مناظر احسن گیلانی۔ **سوانح قاسمی**۔ حصہ دوم۔ دارالعلوم دیوبند۔ بھارت۔ صفحہ 453-450

باب 7: ہندومت کے اہم عقائد ورسوم: اسلام کا موقف

اسلام اور ہندومت کا تصور خدا

دین اسلام کے تمام تر تعلیمات کا محور اور اس کی اساس عقیدہ توحید پر ہے جس کی رُو سے صرف ایک خالق کائنات ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اسلامی تعلیمات میں اس بات کی قطعی گنجائش نہیں ہے کہ مظاہر فطرت اور وہ چیزیں جو انسان کے لیے خوف یا کسی قسم کے نفع کا باعث بنتی ہیں، ان کی نفع بخشی یا ان سے خوف زدہ ہونے کی وجہ سے انسان انھیں پوجنے لگے۔ اسلام تصور خدا کی بابت کسی پیچیدہ نظام عقائد کے بجائے ایک سادہ اور قابل فہم عقیدہ پیش کرتا ہے۔ خدا کی بہت ساری صفات قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر مذکور ہیں۔ تاہم اسلامی الٰہیت کی اس پوری بحث کو قرآن مجید ایک مختصر سی سورت الاخلاص میں نہایت جامع الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ يَلِدْ لا وَلَمْ يُوْلَدْ ۞ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۞

کہو، وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ (قرآن مجید۔ سورۃ الاخلاص)

اسلام میں خدا کا تصور عیسائیت اور ہندومت کے برعکس بالکل غیر شخصی ہے۔ البتہ قرآن میں جہاں خدا کے ہاتھ وغیرہ جیسی صفات کا ذکر ہے ان سب کے بارے میں یہ ماننا ہے کہ یہ صفات مخلوقات جیسی نہیں ہیں۔ تثلیث، ہمہ اوست اور متعدد خداؤں کے خیالات کی شدید مذمت کرتے ہوئے اسلام ایک واحد خدا کو ماننے اور اسی کی پرستش کرنے کی دعوت دیتا ہے جسے توحید کہتے ہیں۔

قرآن مجید کی رو سے توحید کا مطلب ہے کہ انسان قلب و زباں سے اس کا اقرار کرے کہ خدا ایک ہے اور اپنی تمام ذات و صفات اور افعال میں یکتا اور بے مثل ہے۔ قرآن مجید اس امر کی طرف انتہائی اچھوتے انداز میں تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ

اور تم سب کا معبود ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (القرآن مجید۔ سورۃ البقرۃ۔ آیت ۱۶۳)

اسلام میں توحید کا تصور محض اس کی وحدانیت کے اقرار تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ یہ اپنے تقاضات میں وسعت سمیٹے ہوئے ہے۔ جسے ہم تین اہم زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ توحید الربوبیت، توحید الصفات اور توحید العبادۃ۔

توحید الربوبیت: توحید الربوبیت سے مراد یہ ہے کہ بندہ اس بات کا اقرار کرے کہ تمام کائنات

-

کا خالق اللہ عزوجل ہی ہے۔وہ تنہا، بنا کسی کی مدد اور حمایت کے یہ کارخانہ قدرت چلا رہا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

کیا اللہ میں شک ہے آسمان اور زمین کا بنانے والا۔(سورۃ ابراہیم۔ آیت ۱۰)

توحید الصفات: توحید الصفات کا مطلب ہے کہ خدا کے ناموں اور صفات کی وحدانیت کا اقرار کرنا۔ یعنی خدا اپنی صفات میں یکتا ہے۔خدا لافانی ہے تو یہ صفت کسی مخلوق میں نہ گردانی جائے۔خدا کے سوا کسی اور کو لافانی قرار دینا یا کسی کے متعلق ایسا اعتقاد رکھنا توحید کے منافی اور شرک ہے۔

إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا

بے شک اللہ ہی یکتا معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کیلئے کوئی اولاد ہو، (سب کچھ) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کا کارساز ہونا کافی ہے۔ (سورۃ النساء۔ آیت ۱۷۱)

توحید العبادۃ: توحید العبادۃ کا مطلب ہے کہ صرف خدائے واحد کی ہی عبادت کرنا۔ خدا کی ذات و صفات کی وحدانیت کا اقرار کرنے کے بعد لازم ہے کہ انسان اسی خدا کی عبادت کرے اور اسی کے سامنے سر جھکائے جو عبادت کے لائق ہے۔پہلے دو امور پر عمل کیا جائے لیکن توحید العبادۃ کو نظر انداز کر دیا جائے تو سب بیکار ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی رو سے عبادت صرف اللہ کے لئے

ہی خاص ہے۔ اللہ عزوجل کے علاوہ کوئی اور چاہے کتنی ہی بلند ہستی ہو، اسکی عبادت جائز نہیں اور بدترین شرک ہے۔ اسی وجہ سے اسلام میں بت پرستی کو قبیح فعل سمجھا جاتا ہے۔

توحید العبادۃ توحید کا سب سے اہم جز قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے وقت عرب اور دیگر بہت سے مذاہب میں توحید کے پہلے دو جز قائم تھے۔ وہ خدا کو ایک مانتے تھے اور اس کی ذات وصفات میں بھی وحدانیت کا اقرار کرتے تھے۔ لیکن وہ عبادت بتوں، چاند، سورج آگ اور مظاہر فطرت کی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہیں اسی امر کی طرف دعوت دی کہ تخلیق جن وانس کا مقصد اللہ رب العزت کی عبادت کرنا ہے نہ کہ کسی اور ہستی کی۔ فرمان الٰہی ہے۔

إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَلاَ يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا	تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو جسے اپنے رب سے ملنے کی امید ہو اسے چاہیے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

توحید کے دلائل

قرآن مجید کا یہ اسلوب رہا ہے کہ وہ محض دعوت ہی نہیں دیتا بلکہ نا قابل تردید عقلی و فطری دلائل سے مخالفین کو اپنی بات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کثرت پرستوں اور منکرین توحید

کو دعوت دیتے ہوئے بھی قرآن مجید اپنا روایتی اسلوب میں خدا کی وحدانیت کی ایسی پختہ دلیلیں بتاتا ہے، جسے کوئی بھی صاحب عقل شخص نہیں ٹھکرا سکتا۔ فرمان ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ

اللہ نے کوئی بچہ اختیار نہ کیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا یوں ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق لے جاتا اور ضرور ایک دوسرے پر اپنی برتری چاہتا۔ اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بناتے ہیں ۔(سورۃ المؤمنون۔ آیت 91)

اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ

اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو ضرور وہ تباہ ہو جاتے تو پاکی ہے اللہ عرش کے مالک کو ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں۔(سورۃ الانبیاء۔ آیت 22)

یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ اگر خدا ایک سے زیادہ ہوتے اور کامل ذات وصفات کے ہوتے، کیونکہ خدا چاہے ایک ہو یا ہزار، اپنی ذات وصفات میں ناقص ومحتاج ہر گز نہیں ہو سکتا ورنہ خدا ہی کیا۔ کارخانہ کائنات کو چلانے کے معاملات میں ان خداؤں میں یا تو اتفاق ہوتا یا اختلاف۔ ایک سے زائد خداؤں کے متعلق یہ دونوں صورتیں غیر منطقی اور خدا کی عظمت ومرتبے خلاف ہے۔

-

- اگر ہم پہلی صورت یعنی خداؤں کے مابین اتفاق فرض کریں تو اس سے ایک نکتہ یہ نظر آتا ہے کہ ایک خدا تنہا امور کائنات انجام نہیں دے سکتا تھا اس لئے دوسرے خدا نے مل کر انتظام کیا۔ اس رو سے خدا کی ذات ناقص ٹھہرتی ہے کہ وہ کامل قدرت والا نہیں ہے۔ جب ذات ہی ناقص ہو تو خدا کیسا!۔

- اتفاق کی یہ صورت لی جائے کہ ایک خدا نے ہی سارے کام کیے کیونکہ وہ کامل قدرت والا تھا، تو باقی خدا بیکار ٹھہرتے ہیں۔ جب کہ خدا کا بیکار ہونا اس کی شان و عظمت کے منافی اور خلاف مفروض ہے۔

اگر ہم خداؤں کے باہم اختلاف فرض کریں تو اس کے دو ذیلی نکات نظر آتے ہیں جو انتہائی غیر منطقی اور خطرناک ہیں۔

- اختلاف کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا کہ خدا آپس میں مد مقابل ہو جاتے اور جھگڑا بھی کرتے کیونکہ ہر خدا اپنے ارادہ اور تجویز کو عمل میں لانا چاہے گا۔ خداؤں کے مابین اس رسہ کشی میں زمین و آسمان کا نظام برباد ہو جاتا۔ ہر خدا اپنی خلق پر قبضہ کر کے الگ ہو جاتا۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات عین ترتیب، مکمل توازن اور نظم وضبط کے ساتھ موجود ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خدا ایک ہی ہے۔

- اختلاف کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک خدا دوسرے خدا سے شکست کھا جاتا اور مغلوب

خدا کو اپنے مد مقابل کے سامنے جھک جانا پڑتا۔ اور جو خدا مغلوب ہو جائے، یا اپنے مد مقابل کو زیر کرنے میں ناکام رہے وہ خدا ہی کیا۔ وہ تو کمزور اور عاجز ٹھہرا۔

کثرت خدا پر یقین رکھنے والے اپنے اعتقاد کو حق ثابت کرنے کی سعی میں اکثر دلیل دیتے ہیں کہ نظام کائنات میں لا تعداد کام ہیں۔ بارش برسانا، رزق دینا، سورج و چاند کو مقررہ وقت پر چلانا وغیرہ۔ لہٰذا ہر کام کے لئے ایک مخصوص خدا یا دیوتا ہونا ضروری ہے۔ یعنی سورج کا خدا، بارش کا خدا، اولاد کا خدا، محبت کا خدا غرض کہ سب کا الگ الگ خدا ہے۔ لیکن توحید پرستوں اور مسلمانوں کے نزدیک یہ نہایت ہی غیر منطقی دلیل ہے کیونکہ خدا تنہا ہر ایک کام پر قادر ہے۔ تاہم خدا ان امور یعنی نظام کائنات کو چلانے کے لیے دیگر ہستیاں تخلیق کرتا ہے تو بھی اس بارے میں کوئی نفی نہیں ہوتی کہ ان تمام ہستیوں سمیت ہر ایک وجود کا خالق و مالک ایک خدا ہی ہے۔

مزید یہ کہ خدا نے بہت سے کام فرشتوں کے ذمے کیے ہوئے ہیں لیکن انہیں بھی تصرف خدا نے ہی دیا ہے اور وہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہی کرتے ہیں۔ یہ امر بھی محض اس کی خدائیت ہے نہ کہ ضرورت یا مجبوری۔ اگر ہم ان ہستیوں کو خدا کی ضرورت یا مجبوری مان کر کثرت خدا کو تسلیم کر لیں تو پھر ایک خدا کئی کاموں کے لئے نااہل ثابت ہوتا ہے اور مزید یہ کہ یہ خدا دوسرے خداؤں کے کاموں سے ناواقف اور لاتعلق ٹھہرتا ہے۔ کیا خدا کسی کام کے لئے نااہل ہو سکتا ہے؟ کیا خدا کسی کام کو انجام دینے کے لئے ناکافی ہے؟ کیا خدا

لا تعلق ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر کثرت پرستوں کو غور کرکے ایک خدا پر ایمان لانا چاہیے۔

ہم نے دیکھا کہ اسلام کا پہلا ستون توحید ہی عقیدہ تثلیث کا رد کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق خدا بے مثل، تنہا اور یکتا ہے۔ ایک خدا کے علاوہ کسی دوسرے یا تیسرے خدا کے وجود پر اعتقاد رکھنا اسلام میں کفر ہے۔ اسلام اس عقیدے سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔

پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ (خدا) تین ہیں اس عقیدے سے رک جاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے، وہ اسسے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ (قرآن مجید۔ سورۃ النساء۔ آیت 171)

ہندو دھرم میں کثرت خدا کا تصور دراصل مختلف تصرفات کی حامل مقدس ہستیوں سے وابستہ ہے۔ جبکہ قرآن مجید کے مطابق خدا اکیلا تمام تصرفات کا حامل ہے۔ البتہ کچھ فرشتے بھی مختلف کاموں کے لیے مخصوص ہیں۔ سنسکرت میں برہما کا عربی ترجمہ الخالق بنتا ہے جس کے معنی ہیں تخلیق کرنے والا۔ اسی طرح ہندومت میں جو دسرے دیوتا ہیں حفاظت کے لیے، رزق کے لیے، وغیرہ، اسلام میں یہ تمام صفات ایک ہی خدا کی ہیں۔

-

عقیدہ اوتار اور قرآن

چونکہ عقیدۂ اوتار کی تعلیم کا محور یہی ہے کہ خدا نیک لوگوں کی مدد، حق کے قیام اور برائی کے خاتمہ کے لیے دنیا میں آتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں پیغمبروں کا تصور ہی دراصل اوتار کے نظریے کا رد کر دیتا ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے خدا خود زمین پر نہیں آتا بلکہ اس مقصد کے لیے انبیاء کرام علیہ السلام یعنی پیغمبر مبعوث کیے جاتے ہیں۔ خدا کو انسانوں کی ہدایت اور مذہب کے قیام کے لئے لازم نہیں کہ وہ خود انسان بن کر دنیا میں آئے بلکہ خدا نے دنیا میں پیغام حق رائج کرنے کے لئے انسانوں میں سے ہی پیغمبروں اور رسولوں کو مبعوث کیا کہ وہ خدا کا پیغام ان تک پہنچائیں۔

اسلام میں خدا کے تصور کے مطابق خدا وہی کام کرتا ہے جو اس کی شان وصفات کے مطابق ہو۔ خدا کا انسان کی صورت میں زمین پر آنا خدا کی صفات کے منافی ہے۔ انسان ایک فانی ہستی ہے جسے کبھی نہ کبھی موت ضرور آتی ہے۔ جبکہ خدا لافانی اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والی ذات ہے۔ لہٰذا کسی بھی صورت میں خدا کو موت واقع ہونا اس کی عظمت اور صفات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید خدا کو لامثل اور سمیع وبصیر کہہ کر عقیدہ اوتار کا رد کرتا ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ (سورۃ

الشوریٰ۔ آیت 11)

بت پرستی

اسلام کے دونوں ماخذ قرآن و حدیث کے مطابق انسان خدا کو براہ راست نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ہر قسم کی تجسیم سے پاک ہے۔ اس کی طرف ارتکاز توجہ کیلئے بت یا کسی شبیہہ کی ضروت نہیں ۔بت پرستی یا خدا کی شبیہہ بنانا اسلام کے نزدیک نہایت ہی گستاخانہ فعل ہے اور شرک میں شامل ہے جو بدترین گناہ ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر شرک اور بت پرستی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

> لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے، ذرا غور سے سنو! اللہ کے سوا جن جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے گو سارے کے سارے ہی جمع ہو جائیں۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز لے بھاگے تو یہ تو اسے بھی اس سے چھین نہیں سکتے، بڑا بزدل ہے طلب کرنے والا اور بڑا بزدل ہے وہ جس سے طلب کیا جارہا ہے۔ (سورۃ الحج۔ آیت 73)

قرآن مجید کے مشہور مفسر امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> [جن بتوں کو] اپنا حاجت روا و مشکل کشا سمجھ کر پوجتے پکارتے ہیں وہ اتنے عاجز اور اس قدر بے بس ہیں کہ مکھی جیسی حقیر مخلوق بھی نہیں پیدا کرسکتے، اگرچہ وہ سب اس کیلئے مل کر بھی کوشش کریں اور مکھی پیدا کرنا در کنار ان کی بے بسی کا تو یہ عالم ہے کہ اگر کوئی مکھی ان کے پاس رکھی

ہوئی مٹھائی وغیرہ نذر و نیاز میں سے کچھ چھین لے، تو یہ اس کو بھی اس سے چھڑا اور بچا نہیں سکتے، تو پھر ایسی بے حقیقت چیزوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پوجنا پکارنا کس قدر حماقت اور کتنی بڑی عقل دشمنی ہے۔

طبقاتی نظام

ہندومت کے طبقاتی نظام کے بارے میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے کہ اسلام اس قسم کے کسی بھی طبقاتی نظام کو صریح خلافِ عدل ہونے کی بناء پر قبول نہیں کرتا۔ اسلامی شریعت تمام قسم کے امتیازات اور ذات پات، نسل، رنگ، جنس، زبان، حسب و نسب اور مال و دولت پر مبنی تعصبات کو جڑ سے اکھاڑ کر تمام انسانیت کو بلا امتیاز حقوق فراہم کرتی ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی مرد و عورت (آدم و حوا) کی اولاد ہیں اور کوئی ذات یا قوم کسی سے برتر نہیں۔

لوگو! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ (سورۃ الحجرات۔ آیت 31)

مساوات کے اس تصور کی بہترین مثال ہم خطبہ حجۃ الوداع میں دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت محمد صلی

اللہ علیہ وسلم نیاپنے آخری خطبے میں نوع انسانی کو خون کے رشتے کی بنیاد پر ایک برادری قرار دیتے ہوئے ایمان کی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دے کر ان کے درمیان بھی کامل مساوات قائم کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر تقویٰ کے سبب ہے۔ (مسند احمد)

کوئی ذات یا قوم کسی سے برتر نہیں۔ تمام انسان ایک ہی مرد و عورت (آدم و حوا) کی اولاد ہیں۔ کوئی شخص چاہے سید ہو، مغل ہو، عثمانی ہو یا حبشی، معاشرے میں سب مساوی حیثیت کے حامل ہیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے والا کسی بھی رنگ و نسل اور منصب کا ہو اسے سزا یقینی ملنی ہے اس میں ذات و قوم کے تحت کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ کسی سے محبت و نفرت کے بناء پر انصاف نہ کرنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان سے خدا تعالیٰ مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

اے ایمان والوں! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات پر مجبور نہ کرے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو۔ عدل کیا کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے ۔(سورۃ المائدہ: آیت 8)

علامہ شاہ محمد اسماعیل شہید تذکیر الاخوان میں لکھتے ہیں:

ذات بڑی ہونے سے آدمی میں کچھ بڑائی اور بزرگی نہیں آجاتی، ذاتیں صرف پہچاننے اور تعارف

کے واسطے ہیں بزرگی اور بڑائی اللہ کے نزدیک تقویٰ کی ہے۔ جس کو بہت تقویٰ ہے وہ اللہ کے نزدیک بزرگ ہے اگرچہ کم ذات ہو اور جس کو تقویٰ نہیں وہ اللہ کے ہاں بزرگ نہیں اگرچہ ذات کا بڑا ہو۔ موچی، دھنیے، جولاہا، پرہیز گار، شیخ، سید، مغل، پٹھان، فاسق، بدکار سے اچھا ہے۔ پھر بڑی ذات پہ مغرور ہونا اور فخر کرنا محض حماقت اور نادانی ہے۔(فصل 7۔ باب افتقار بالانساب)

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کی ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کسی بھی قسم کے نسلی امتیاز، ذات پات، اور قومیت کو فضیلت و برتری کی بنیاد نہیں مانتا۔ رنگ، نسل، قبائل اور ذات کی یہ تقسیم فضیلت و برتری کے لیے نہیں بلکہ محض شناخت کے لیے ہے۔ کوئی کالا گورے پر برتری ثابت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس سے نفرت کی جاسکتی ہے۔ خدا کے سامنے تمام انسان برابر ہیں۔ برتری کا معیار صرف انسان کا کردار ہے۔ خدا کے ہاں وہی محبوب و برتر ہے جو حسن اعمال اور نیکی میں سب سے بڑھ کر ہو۔

تناسخ اور اسلام

قرآن مجید کے مطابق انسان کی روح مرنے کے بعد عالم برزخ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ بعض محققین نے عالم برزخ کو حالت خواب سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے بعد روزِ قیامت میں انسان کے اعمال کے مطابق اسے جنت و دوزخ کی صورت میں سزا و جزا دی جائے گی۔ قرآن مجید واضح

-

الفاظ میں اس عقیدے کی تردید کرتا ہے موت کے بعد انسان کی روح پھر سے دنیا میں پلٹ کر آجائے اور اپنے عمل کے مطابق کوئی صورت اختیار کرے۔

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی (تو) وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے۔ تاکہ میں اس (دنیا) میں کچھ نیک عمل کر لوں جسے میں چھوڑ آیا ہوں۔ ہر گز نہیں، یہ وہ بات ہے جسے وہ (بطورِ حسرت) کہہ رہا ہو گا اور ان کے آگے اس دن تک ایک پردہ (حائل) ہے (جس دن) وہ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے۔(سورۃ المؤمنون: آیت100-99)

اس حوالے سے مسلم مفکرین کی جانب سے جو تنقید عقیدہ تناسخ پر کی جاتی ہے انھیں ہم کتاب کے گزشتہ ماڈیول "ہندومت کا تفصیلی مطالعہ" میں نقل کر آئے ہیں۔

باب8:ہندومت اور رسالت و نبوت

پیغمبروں کا تصور ہر مذہب میں رائج رہاہے لیکن ان مذاہب کے ماننے والوں نے اسے مختلف صورتوں میں اپنایاہے۔ ہمارے سامنے اس کی سب سے واضح مثال عیسائیوں کی ہے جنہوں نے خدا کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دے دیا۔ لیکن عیسائیوں میں بعض گروہ ایسے بھی ہیں جو عیسیٰؑ کو پیغمبر ہی مانا ہے۔ بعینہ یہی معاملہ ہندو دھرم کا بھی ہے۔ اس قدیم ترین مذہب میں بھی تصور رسالت "اوتار" کے نام سے واضح طور پر موجود ہے لیکن نے بھی عیسائیوں کی طرح خدا کے پیغمبر کو خدا قرار دے دیاہے اور انھیں خدائی صفات سے نواز کر انھیں خدا کا ہم سر ٹھہرا دیا ہے۔

اوتار کے لغوی معنی یا ویدوں کے کسی بھی منتر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا انسانوں کی ہدایت کے لیے خود زمین پر آتا ہے ۔ ہندوؤں کے مشہور عالم سوامی ویویک آنند (1863-1906) اور سکھ مت کے بانی گرو نانک (1469-1539) جیسے لوگوں نے ہندومت میں تصور نبوت کی تصدیق کی ہے۔ البتہ اکثر ہنود عقیدہ اوتار سے مراد خدا کا نزول بھی قرار دیتے ہیں اور اس کی سند گیتا کی اس اشلوک سے لیتے ہیں:

جب کبھی دھرم کا زوال ہوتا ہے، اور بدی پھیلتی ہے، تب میں خود ظاہر ہوتا ہوں۔ نیکوں کی

-

حفاظت اور جو برے ہیں انھیں ختم کرنے کے لیے۔ نیکی کے قیام کے لیے ہر عہد بعد میں خود ظاہر ہوا ہو۔ (بھگود گیتا۔ ادھیائے 4۔ اشلوک 8-7)

اس اشلوک میں اگرچہ شری کرشن یہ کہہ رہے ہیں کہ میں ہر عہد میں خود کو ظاہر کرتا ہوں، لیکن اگر ہم کرشن کو ایک خدا کا بندہ مان کر اس اشلوک کا مفہوم سمجھیں تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بات مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کی تفہیم کے لیے ایک انتہائی اہم اصول ہے کہ ہر مذہبی اندازِ بیاں مختلف نوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض جگہ خدا متکلم ہوتا ہے اور بعض جگہ غائب کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ ایک پیغمبر اپنی کتاب میں جو کچھ بولتا ہے وہ خدا کی طرف سے بولتا ہے۔ چنانچہ ممکن ہے گیتا میں ایسی اشلوک اور صفاتِ الٰہی بیان کی گئی ہیں یا خود کے ظہور کا اظہار کیا گیا ہے تو وہ بھی شری کرشن نے کہے ہوں گے مگر وہ خدا کی طرف سے کہہ رہے تھے۔ چنانچہ اس اشلوک کا سیدھا سادہ مفہوم یہی ہے کہ جب جب دنیا سے خدا کا نام مٹنے لگتا ہے، لوگ دین الٰہی کو بھول کر مخلوق پرستی میں مبتلاء ہو جاتے ہیں اور اصل خدا کی ہستی کو اپنی زندگی سے نکال دیتے ہیں تب اوتار یعنی پیغمبروں کے ذریعے خود کو دوبارہ دنیا میں ظاہر کرتا ہے۔ موجودہ دور میں اس کی تشریح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ جب بھی ادھرم یعنی الحاد پھیلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ پاک کو ظاہر کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل جب سائنسی ترقی کے سبب خدا کے انکار کا رجحان پیدا ہوا تو اگلے ہی مرحلے سائنس کے سامنے بہت سے ایسے حقائق آئے جس کی بدولت انھیں خدا کو تسلیم کرنا پڑا۔

یعنی اس اشلوک میں بتایا گیا ہے نبی کی صورت میں خدا خود کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ نبی بھی خدا کا مظہر ہوتا ہے، وہ زمانے میں رائج باطل معبودوں میں معبود برحق کو ظاہر کرتا ہے اور اسی کی پرستش کی تعلیم دیتا ہے۔ شری مد بھاگوت مہا پران کی اس اشلوک سے پیغمبروں کا عقیدہ یعنی عقیدہ رسالت مزید واضح ہو جاتا ہے:

جب بھی بھلائی کم ہو کر گناہ بڑھ جاتے ہیں تو ہری جو تمام خداؤں کا خدا ہے وہ یقیناً (رہنمائی کے لیے) ایک جان پیدا کرتا ہے۔ (بھگوت پران۔ چانت 9۔ باب 24۔ اشلوک 56)

ان اشلوکوں پر چڑھائے گے حاشیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ایسا ہی عقیدہ مسلمانوں کا ہے، یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے انبیاء زمین پر بھیجے جاتے رہے ہیں۔ اوتاروں کی حقیقت بھی غالباً یہی ہے جسے ہم عام معنوں میں پیغمبر کہتے ہیں۔ ہندو دھرم کی کتب مقدسہ میں موجود تصور رسالت کم و بیش اسلام اور ابراہیمی روایات کے عین مطابق ہے۔ تفہیم میں معمولی سی غلطی نے اس عقیدے کو بگاڑ کر خدا کے زمین پر آنے سے تعبیر کر دیا ہے اور پھر وہ مذہبی مصنفین جنہوں نے ان کتابوں کی تشریح لکھی اور عوام نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے وہی معنی لیے جو انھوں نے بیان کر دیے اسی لیے یہ غلطی چلتی رہی۔

شریعت کے اختلاف کو بھی گیتا یوں بیان کرتی ہے:

جو جس طرح میری عبادت کرے، میں اسی طرح انھیں جزا دیتا ہوں کرتا ہوں۔ ہر کوئی مختلف راستوں سے میری اتباع کر رہا ہے۔ (بھگود گیتا۔ ادھیائے 4۔ اشلوک 11)

-

اس ادھیائے (باب) کے شروع میں بھی گیتا اپنے الفاظوں میں اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اس کا دھرم کوئی الگ نہیں بلکہ یہ وہی مذہب یا دھرم ہے جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو دیا گیا۔

> یہ عظیم گیان پرم پرا سے ملتی تھی۔ اس یوگ کو راج رشیوں نے یوں جانا' لیکن وقت گزرنے پر روایت کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اس لیے یہ یوگ گمشدہ دکھائی دیتا ہے۔ (بھگود گیتا۔ ادھیائے 4۔ اشلوک 2-3)

واضح رہے کہ بھگود گیتا کم و بیش 3000BC یا اس سے قبل کے دور میں شری کرشن نے بیان کی۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق بھی اس دور میں بیک وقت دنیا کے مختلف خطوں میں موجود پیغمبروں کی مختلف شریعت اور مذاہب ہونا صحیح ہے۔ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوؤں کی مقدس شخصیات میں پیغمبر بھی ہوسکتے ہیں جو اس قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے، لیکن وہ پیغمبر جو بھی ہوں اس وقت ہندومت میں خدا اور دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ تاہم خوش قسمتی سے خود ہنود کے بعض فرقے اوتار کو پیغمبر ہی مانتے ہیں اور بعض انھیں خدا کے نیک بندے کہتے ہیں مثلاً آریا سماج والے عقیدۂ اوتار کا شدید انکار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق شری کرشن جیسے صالح لوگوں کو خواہش ہوتی ہے کہ وہ دھرم کے قیام کے لیے دوبارہ جنم لیں چنانچہ اس میں کسی قسم کا کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ اس کا اظہار (گیتا میں) کریں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشہور سنسکرت عالم البیرونی نے اسلامی کلمہ توحید کا ترجمہ سنسکرت میں کیا تھا، اس میں رسول کے لیے لفظ "اوتار" کا ہی استعمال کیا۔

-

محمود غزنوی کے دور کا سکہ۔ ایک جانب عربی اور دوسری جانب سنسکرت میں کلمہ درج ہے۔

قصہ آدم و حواء علیہما السلام۔۔۔

تخلیق آدم علیہ السلام

نسل انسانیت کا آغاز جس ہستی سے ہوا انھیں قرآن اور بائبل میں آدم (علیہ السلام) کہا گیا ہے۔ یہ وہ اولین انسان تھے جنھیں سب سے پہلے تخلیق کیا گیا اور دنیا میں بھیج کر انھیں نبوت بھی دی گئی۔ یہ تصور صرف اسلام، عیسائیت اور یہودیت میں ہی نہیں بلکہ ہندو دھرم میں بھی موجود ہے۔ ویدوں اور ہندوؤں کی دیگر مقدس کتابوں میں ایک اصطلاح "منو" استعمال ہوئی ہے۔ یہ اصطلاح کسی ایک شخص کے لیے نہیں بلکہ مختلف شخصیات کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ منو

دراصل ہندوؤں کے ان مقدس شخصیات کو کہتے ہیں جن سے نسل انسانی جاری ہوئی ہے اور انھیں خدا سے حکمت (نبوت؟) بھی ملی ہو۔ ویدا اور دیگر کتابوں میں مجموعی طور پر مختلف 15 منو کا ذکر کیا گیا ہے۔

"پران" کے مطابق ان میں سے سب سے پہلے منو کا نام "سَوَیَمبھو" ہے۔ اور اس کی بیوی "شتارپا" ہے۔ ہندوؤں کے ہاں ایک ہی شخصیت کے لیے کئی صفاتی نام استعمال ہوئے ہیں؛ لہٰذا اس منو کا ذکر بھی ویدوں میں مختلف ناموں سے کیا گیا ہے جن میں براہمہ، آدی پرش، پرجاپتی اور دیگر نام استعمال ہوئے ہیں۔ اس اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کریں تو قرآن مجید کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔

بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جسے مٹی سے تخلیق کیا گیا اور پھر کہا ہو جا۔ سو وہ ہو گیا۔ (سورۃ ال عمران: آیت 59)

مثل عیسیٰؑ سے مراد یہ ہے کہ وہ بنا باپ کے پیدا ہوئے جس طرح حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ اس کے علاوہ ہمیں قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ بھی بیان ملتا ہے کہ انسان کو پانی اور نطفے سے بھی تخلیق کیا گیا۔

اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا۔ (سورۃ الفرقان: آیت 54)

پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے نچوڑ (یعنی نطفہ) سے چلایا۔ (سورۃ السجدۃ: آیت 32)

-

بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا فرمایا۔(الدھر: آیت76)

مفسرین کے مطابق قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کو نسل انسانی کا باپ بتایا گیا ہے، یعنی دنیا کے تمام انسان انھیں کی اولاد ہیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

اے لوگوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔(سورۃ الحجرات: آیت13)

اسلامی تصور کے بعد اب وید اور ہندو دھرم کی دیگر کتب مقدسہ دیکھتے ہیں۔ وید میں آدم علیہ السلام کے لیے جو صفاتی نام استعمال ہوئے ہیں ان میں سے آدی پرش اور سویمبھو اہم ہیں۔ رگ وید منڈل 10 کی سوکت 90 "پرش سکت" کہلاتی ہے۔ یہ سوکت تخلیق کائنات کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے اور یہ ویدوں کی اہم سوکت میں سے ایک ہے۔ اگرچہ اس کا ترجمہ کئی ہندو اور مغربی سکالرز نے کیا ہے، اور مفہوم کے اعتبار سے بیشتر مترجمین نے معمولی تغیر کے ساتھ ایک ہی ترجمہ پیش کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے الفاظوں کی وسعت کی وجہ سے اس کا صحیح (Accurate) ترجمہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ بہر حال اس سوکت کا منتر نمبر 5 یوں ہے:

تَسمادوِیرد اَجایتَ۔ ویراجو آدی پُرشا۔ ساجاتو اتیاریچیات۔ پشچھادبھومتھا پورا۔

ہم یہاں اس منتر کا ترجمہ جمہور مترجمین بالخصوص وید کے سب سے اہم بھاشیہ کار (مفسر) سائن اچاریہ (1387) کی تفسیر کے مطابق ترجمہ کر رہے ہیں۔

-

اس پرش سے ویرج پیدا ہوا۔ اور اس ویرج سے آدی پرش۔ جیسے ہی وہ پیدا ہوا اس نے خود کو تقسیم کیا اور پھر ساری زمین پر پھیل گیا۔ انھوں نے شہر تعمیر کرنا شروع کیا۔ (رگ وید: منڈل 10، سوکت 90۔ منتر 5)

اس منتر میں لفظ "آدی پرش" استعمال ہوا ہے جو دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ آدی کے معنی "اولین" ہیں اور پرش کے معنی انسان اور روح وغیرہ ہیں۔ یعنی آدی پرش سے مراد "اولین انسان" ہے۔ چنانچہ اس منتر کے مطابق ایک روحِ اعلیٰ سے ویرج یعنی تخم کی تخلیق ہوئی اور پھر اس سے آدی پرش یعنی اولین انسان تخلیق کیا گیا جس سے ساری زمین میں نسلِ انسانیت پھیل گئی۔ اس آدی پرش یعنی سویمبھو منو اور اس کی بیوی شتارپا سے نسل انسانی کے اجراء کے متعلق معروف ہندو رشی سوامی تلسی داس (-1532 1623) اپنی کتاب رام چرت مانس میں لکھتے ہیں:

سویمبھو منو اور اس کی بیوی شتارپا سے نسلِ انسانی پیدا ہوئی۔ (رام چرت منس۔ بالکنڈ 2۔ اشلوک 141)

یہ سویمبھو منو کی اولاد ہی تھی جس کے ذریعے دنیا میں آبادی ہوئی۔ (وشنو پران۔ انس 1۔ ادھیائے 1)

پران میں آدم علیہ السلام کے لیے جو نام سویمبھو آیا ہے اس کے لغوی معنی ہیں "جو خود سے پیدا ہو۔" ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید میں بھی آدم علیہ السلام کا لقب "مثل عیسیٰ" دیا گیا جس سے مراد یہی ہے کہ وہ بنا باپ کے پیدا ہوئے۔ وید کے یہ تمام منتر اپنے مفہوم کے اعتبار سے قرآن

کے مطابق ہیں۔ تخم کے علاوہ پانی سے انسان کی تخلیق کے متعلق بھی ہمیں ہندوؤں کی مقدس کتاب اپنشد میں بیان ملتا ہے کہ:

> یہ زمین ،خلا، آسمان، پہاڑ ، دیوتا، آدمی، چرند، پرند، گھاس، درخت اور کیڑوں پتنگوں اور چیونٹیوں سے لے کر تمام جانور پانی کی ہی مختلف صورتیں ہیں پس تم پانی کی اپاسنا کرو۔ (تیتریہ اپنشد۔ ادھیائے 7۔ کھنڈ 10)

اتھروید کے گیارہویں کانڈ کے آٹھویں سوکت میں بھی سویبھو منو کی پیدائش کا ذکر وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔ یہاں انہیں منو کہا گیا ہے اور ان کی اہلیہ کو "ادیا" کہا گیا ہے۔ سنسکرت میں "ادیا" کا مطلب ہے پہلی۔

جیسا کہ ہم نے پڑھا تھا کہ بدھ مت میں بھی تصور رسالت موجود ہے؛ لہٰذا سب سے پہلے پیغمبر کو بدھستوں کے یہاں "ایتابھ بدھ" کہا جاتا ہے۔ ایتابھ بدھ کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات بدھ مت کے فرقے مہایان سے ملتی ہے۔ اسی فرقے میں ان کی پرستش اولین بدھ کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ ان کے متعلق ایک مقدس زمین کا بھی تصور ہے جہاں وہ ایک عرصہ مقیم رہے۔

علم الاسماء

قرآن مجید اور بائبل بتاتی ہے کہ تخلیق آدمؑ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو کچھ نام سکھائے

گئے اور انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ قرآن مجید میں ہے:

پھر اللہ نے آدمؑ کو سب کے نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے لائے اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ تو انھوں نے کہا! تو پاک ہے، جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں، بے شک تو دانا (اور) حکمت والا ہے تب خدا نے (آدمؑ) کو حکم فرمایا کہ اے آدمؑ! تم ان کو ان کے نام بتاؤ، جب انھوں نے ان کے نام بتائے تو (فرشتوں سے) فرمایا کیوں؟ میں نے تم سے نہ کہا تھا، کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں ۔(سورۃ البقرۃ: آیت 33-31)

بائبل میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے۔

تب خداوند نے تمام جنگلی درندے اور ہوا کے سب پرندے مٹی سے بنائے اور وہ انھیں آدمؑ کے پاس لے آیا تاکہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے اور آدم نے ہر جاندار مخلوق جو جس نام سے پکارا وہی اس کا نام ٹھہرا اس طرح آدمؑ نے سبھی چرندوں، ہوا کے پرندوں اور سارے جنگلی درندوں کے نام رکھے۔(کتاب پیدائش: باب 2۔ آیت 20-19)

اس معاملے میں جب ہم وید کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں کے مطابق بھی آدی پرش کی تخلیق کے بعد اسے گیان یعنی علم دیا گیا۔ رگ وید میں ہے۔

برہسپتی نے سب سے پہلے تمام اشیاء کو نام دیے اور یہ اس کی تعلیم کی پہلی سیڑھی تھی۔(رگ وید: منڈل 10، سوکت 71۔ منتر 1)

اس منتر کی تشریح میں سوامی ودیانند لکھتے ہیں:

رگ وید کے 10/71 سوکت کا موضوع بحث یہ ہے کہ تخلیق (کائنات) کے آغاز میں بھگوان نے انسان کو کس قسم کا گیان دیا۔

مہابھارت میں یہ بات مزید وضاحت سے بیان کی گئی ہے کہ منو کو حکمت سے نوازا گیا۔

منو کو اعلیٰ علم و حکمت سے سیر اب کیا گیا اور وہ ساری نسل انسانیت کا مورث بنا۔ ساری نسل انسانی منو کی نسل سے ہوئے اسی لیے سب کو مانو کہا جاتا ہے۔ (مہابھارت۔ کتاب 1۔ آدی پروا، سمبھو پرو)

اس اشلوک میں ایک اور بات ہمیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئی کہ جس طرح آدم علیہ السلام کی اولاد آدمی کہلاتی ہے اسی طرح منو کی اولاد مانو کہلاتی ہے۔

آدمؑ کو سجدہ

قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کو علم عطا کیے جانے کے بعد ذکر ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں چنانچہ ابلیس کے علاوہ تمام ملائکہ نے آدم علیہ السلام سجدہ کیا۔ وید بھی اس بات سے ذرا بھی اختلاف نہیں کرتا۔

تخلیق کے وقت برہمان نے اپنے علم کا نچوڑ دیوتاؤں کو دیا اور کہا کہ جو بھی برہمان کے آگے جھکے گا اور اس کی معرفت حاصل کرے گا تو دیوتا اس کے قابو میں ہو جائیں گے۔ (رگ وید۔ دیوتلیا انواک 2۔ منتر 5)

کیا یہ قریب قریب وہی تصور نہیں جو قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا؟

حواء کی تخلیق

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور انھیں علم الاسماء سکھانے کے بعد خدا تعالیٰ نے انہی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ یعنی ایک جان کو دو جنس میں تقسیم کر کے ایک کو مرد اور ایک کو عورت بنایا۔ حوا کی پیدائش کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

لوگوں! اپنے پرودگار سے ڈرو! جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ (سورۃ النساء: آیت 1)

صحیح بخاری میں حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کا برتاؤ رکھو بے شک عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے۔ (صحیح بخاری: اکتاب الانبیاء، باب حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کی پیدائش)

بائبل میں حضرت حواء کی پیدا کے متعلق لکھا ہے:

آدمؑ کے لیے اس کی مانند کوئی مدد گار نہ ملا۔ تب خداوند نے آدمؑ پر گہری نیند بھیجی اور جب وہ سو رہا تھا تو اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکال لی اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا۔ تب خداوند خدا نے اس پسلی سے جسے اس نے آدمؑ سے نکالا تھا، ایک عورت بنائی اور وہ اسے آدمؑ کے پاس لے آیا۔ (کتاب پیدائش: باب 2۔ آیات 22-21-20)

نفسِ واحد سے دوسری جنس کی تخلیق کے بارے میں منودھرم شاستر میں بھی لکھا ہے:

برہمہ نے اپنے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کیا، نصف مرد اور نصف عورت۔ اور اس عورت سے اس نے دنیا بنائی (آباد کی)۔ (منودھرم شاستر۔ ادھیائے 1۔ اشلوک 32)

یہی بات مزید وضاحت سے اپنشد میں بیان کی گئی ہے۔

اس (روحِ اعلیٰ) نے ایک مرد اور عورت کو مربوط صورت میں بنایا۔ پھر اسے دو حصوں میں علاحدہ کیا، مرد شوہر بن گیا اور عورت بیوی۔ یعنی ابتدا میں مرد اور عورت ایک ہی جسم میں تھے' پھر اس میاں بیوی نے جنسی تعلق قائم کیا اور ان سے مخلوق پیدا ہوئی۔ (برہدار نیک اپنشد۔ ادھیائے 1۔ برہمن 4)

شجرِ ممنوعہ، مکرِ ابلیس اور نزول آدم علیہ السلام

قرآن مجید اس کے آگے کے واقعات کو یوں بیان کرتا ہے۔

پھر ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا؛ ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے۔ آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا، تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہین گزر بسر کرنا ہے۔ اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا

معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔(سورۃ البقرۃ: آیت 53 تا 37)

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے آدم و حواء علیہما السلام کی تخلیق کے بعد انھیں جنت میں رکھا اور حکم دیا کہ جو چاہو کھاؤ پیو سوائے اس ایک درخت کے جس کے متعلق منع کیا گیا ہے۔ اس درخت کا پھل کھانا تو درکنار اس کے قریب بھی نہ جانا۔ لیکن مشیتِ ایزدی کے تحت شیطان نے آدم و حواء علیہم السلام کو بہکایا اور انھوں نے وہ پھل کھالیا چنانچہ انھیں زمین پر بھیج دیا گیا۔ اس بارے میں قرآن مجید میں وضاحت نہیں ہے کہ شیطان کس طرح جنت میں داخل ہوا، البتہ بائبل بتاتی ہے کہ شیطان سانپ کی صورت میں آیا تھا۔

> خداوند خدا نے جتنے دشتی جانور بنائے تھے سانپ ان سب سے چالاک تھا۔ اس نے عورت سے کہا: کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ تم باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا: ہم باغ کے درختوں کا پھل کھاسکتے ہیں لیکن خدا نے یہ ضرور کہا ہے کہ جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کا پھل مت کھانا بلکہ اسے چھونا تک نہیں؛ ورنہ تم مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا: تم ہرگز نہیں مروگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیکی اور بدی کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ جب عورت نے دیکھا کہ اس درخت کا پھل کھانے کے لیے اچھا ہے اور دیکھنے میں خوش نما اور حکمت پانے کے لیے خوب معلوم ہوتا ہے تو اس نے اس میں سے لے کر کھایا اور اپنے خاوند کو بھی دیا جو اس کے ساتھ تھا اس نے بھی کھایا، تب ان دونوں کی آنکھیں کھل گی اور انھیں معلوم ہوا کہ وہ برہنہ ہیں اور انھوں نے انجیر کے پتوں سے اپنے لیے پیش بند بنا لیے۔(کتاب پیدائش: باب 3۔

-

آیت 1-7)

شجر ممنوعہ کا پھل کھالینے کے بعد بائبل اور قرآن کے مطابق آدم و حواء علیہم السلام کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا اور پھر زمین پر نسل انسانیت کا اجراء ہوا۔

بھوشیہ پران ہندوؤں کے مقدس پرانوں میں سے ایک اہم پران ہے ۔ اس میں آدم اور حواء علیہم السلام کے بارے میں نہایت واضح طور پر یہ سب بیان کیا گیا ہے۔

> آدمؑ نام والا پرش ہوا، اور اس کی بیوی حویہ وتی نام والی کہلائی گئی ہے۔ پردان نگر (جنت) کے مشرقی حصے میں مہاپرمیشور کے ذریعہ بنایا گیا خوب صورت چار کوس کے رقبہ کا بہت بڑا جنگل تھا۔ گناہ والے درخت کے نیچے جا کر بیوی کو دیکھنے کی بیتابی سے آدمؑ حوّا کے پاس گئے۔ تبھی سانپ کی شنک بنا کر وہاں فوراشیطان نمودار ہوا۔ اس چالاک دشمن کے ذریعے آدم و حوا دھوکا کھا گئے۔ اور وشنو کے حکم کو توڑ ڈالا اور دنیا کا راستہ دکھانے والے اس پھل کو شوہر نے کھالیا۔ ان دونوں کے ذریعے انجیر کے پتوں سے ہوا کی غذا حاصل کی گئی۔ تب ان دونوں سے بہت سی اولادیں پیدا ہوئی۔ آدمؑ کی عمر نو سو تیس سال ہوئی۔ (بھوشیہ پران۔ پرتی سگ پرو۔4۔ اشلوک 29-33)

یہاں بعینہ وہی باتیں یہاں بیان کی گئیں ہیں جو قرآن اور بائبل میں ہیں۔ اس کے علاوہ شجر ممنوعہ جو بائبل کے مطابق انجیر کا درخت تھا، اس کا ذکر ہمیں وید میں بھی ملتا ہے۔ رگ وید منڈل 1، سوکت 164 میں بیسویں منتر میں ہمیں یہ کہانی دو پرندوں کے متعلق ملتی ہے جس کے مطابق

ایک درخت پر خوبصورت پروں والے پرندے کا ایک جوڑا رہتا تھا جن کے درمیان محبت و الفت کا رشتہ تھا، ان میں سے ایک نے انجیر کے درخت کا شیریں پھل کھالیا اور دوسرا اسے تکتا رہا، وہ پرند پھل کھاتے ہی فکر و غم کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایشور کی طرف رجوع (توبہ) کرتا ہے تو اس کا غم جاتا رہتا ہے۔ یہی کہانی ہمیں ہندوؤں کی مقدس کتاب منڈک اپنشد میں بھی ملتی ہے۔

اپنشد میں منقول اس کہانی میں ایک کے لیے آتم اور دوسرے کے لیے جیو کا لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں لفظ ہی عبرانی زبان کے Adam اور Eve کے مترادف ہے کیونکہ سنسکرت میں ت اور د ایک ہی طرح سے استعمال ہوتا ہے اور ج کو اکثر انگریزی "E" سے تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ سوامی چندریکھندرا سرسوتی (1894-1994ء) نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ ابراہیمی مذاہب میں موجود آدم و حوا علیہم السلام کی یہ روایت اپنشد سے نقل کی گئی ہے۔[1] یہ دعویٰ اپنی جگہ کئی دلائل کی بناء پر محل نظر ہے البتہ ان دونوں قصوں میں مماثلت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آدمؑ کہاں اترے؟

حضرت آدم علیہ السلام زمین پر کہاں اترے؟ اس بارے میں علمائے اسلام نے اختلاف کیا ہے۔ بعض علما کے مطابق آدمؑ عرب میں اترے، بعض کے مطابق عراق میں۔ لیکن ان میں سے ایک

[1] Chandrasekharendra Swami, ***Hindu Dharma***:, P.94

مشہور قول یہ بھی ہے کہ آدم علیہ السلام ہند میں اترے۔ پندرہویں صدی کے مشہور عالم علامہ جلال الدین سیوطی (1505-1445) اپنی تفسیر در منثور میں مختلف مقامات پر لکھتے ہیں:

امام ابن جریر، حاکم اور بیہقی نے اللبعث میں اور اور ابن عساکر سے روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب نے فرمایا: بہترین آب و ہوا کا علاقہ ہند ہے۔ اس میں آدمؑ کو اتارا گیا اور اس کی ہوا کو جنت کے درخت سے معلق کیا گیا۔۔[1] آدمؑ کو سب سے پہلے ہند میں اتارا گیا اور بعض روایتوں میں ہے کہ ہند میں دجنا کے علاقے میں اتارا گیا۔ ۔۔[2] جب آدم علیہ السلام کو ہند کی زمین پر اتارا گیا تو آپ کے ساتھ جنت کے درخت بھی تھے۔ انھوں نے ان کو بھی زمین پر لگادیا۔۔[3] حضرت آدمؑ ہند کی سرزمین پر اترے اور آپ کے ساتھ جنت کی چار لکڑیاں تھیں یہ وہ لکڑیاں تھیں جن کے ساتھ لوگ خوشبو حاصل کرتے تھے۔[4]

ہندوستان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قول انتہائی مشہور ہے کہ:

[1] عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی۔ **تفسیر در منثور**۔ اردو ترجمہ: پیر محمد کرم علی شاہ ازہری۔ ادارہ ضیاء المصنفین۔ بھیرہ شریف۔ جلد اول صفحہ 152۔(2006)

[2] ایضاً۔ ص152

[3] ایضاً۔ ص153

[4] ایضاً۔ ص154

مجھے ہندوستان سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔[1]

یہ قول اکثر کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا جاتا ہے حتیٰ کہ برصغیر کے عظیم شاعر و فلسفی ڈاکٹر علامہ اقبال نے بھی اپنے شعر "میز عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے" میں اس قول کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا ہے لیکن ہمیں یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے ہی کتاب میں ملا۔ بہر حال اس ٹھنڈی ہوا سے مراد کہیں یہ تو نہیں اس دنیا میں سب سے وحی الٰہی سے منور ہونے والا خطہ ہند کا ہے؟

دلچسپ بات ہے کہ ہند (پاکستان، چین، نیپال اور سری لنکا) کے خطے سری لنکا میں شری پاد نام کے پہاڑ پر ایک بہت بڑے پاؤں کا نشان ہے۔ اس پاؤں کے نشان سے بہت سے مذاہب کی مختلف روایتیں منسوب ہیں۔ بدھ مذہب والے اسے گوتم بدھ کے پاؤں کا نشان کہتے ہیں۔ ہندو اسے شیو جی کے پیروں کا نشان مانتے ہیں اور اہل عرب اسے حضرت آدم علیہ السلام کے پاؤں کا نشان مانتے ہیں۔

ہندوؤں کے مقدس دریا گنگا کے بارے میں مسلم مورخ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ جنت سے چار دریا نکلے ہیں۔ نیل، فرات، جیحون اور سیحون۔ نیل تو مصر

[1] امام حاکم۔ **المستدرک علی الصحیحین**۔ کتاب تواریخ المتقدمین من الانبیاء والمرسلین۔ صفحہ 638 مترجم: شاہ محمد چشتی۔ ادارہ پیغام القرآن۔

کا دریا ہے۔ جس پر مصر کی زراعت کا دارومدار ہے۔اسی طرح فرات کی جو اہمیت عراق کی سرسبزی وشادابی کے لیے ہے وہ ظاہر ہے۔ جیحون ترکستان کا دریا ہے، اور ترکستان کے لیے اس کی وہی حیثیت ہے جو نیل وفرات کی مصر وعراق میں اور سیحون کے متعلق ہے کہ یہ ہندوستان کے دریا کا نام ہے۔ کیا جنت کے اس چوتھے دریا کو گنگا سمجھا جائے؟ بعض لوگوں نے اس کو دریائے سندھ قرار دیا ہے۔[1]

ندوی صاحب کی بیان کردہ یہ روایت دراصل معروف صوفی بزرگ ابن عربی (1146-1240) نے اپنی کتاب "احکام القرآن" کے باب "مسائلة انزل الله من" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابو جعفر احمد بن محمد بن اسماعیل النحاس (Hijri: 337) نے "معانی القرآن الکریم" میں نقل کی ہے۔ ہندوستان کا یہ دریا گنگا ہو یا سندھ، یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کو بھی خدا تعالیٰ نے تقدیس بخشی ہے۔

علاوہ ازیں گجرات (پاکستان) میں بریلہ میں ایک 70 گز طویل قبر ہے، اس بارے میں اگرچہ کوئی بھی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے البتہ یہ قبر حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند قنوط سے منسوب کی جاتی ہے؛ جبکہ یہیں بعض قبریں حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اسی طرح سری لنکا سے ہی قریب ہندوستانی ریاست تامل نادو کے ایک شہر رمیشورَم، جو کہ بنارس کی طرح ہندوؤں کا ایک قدیم مقدس شہر ہے، یہاں ایک لمبی قبر ہے جو حضرت آدم

[1] سید سلیمان ندوی۔ **عرب وہند کے تعلقات**۔ ص20۔ لاہور: مشعل بکس

علیہ السلام کے فرزند ہابیل سے منسوب کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان قبول کی لمبائی ان میں موجود اجسام کی وجہ سے نہیں ہے؛ شاید مقامی توہم پرستی کی وجہ سے ہو۔

علم تاریخ سے شغف رکھنے والے قارئین یہ بھی جانتے ہوں گے کہ قدیم دور سے ہی ہندوستان اور عرب کے تعلقات رہے ہیں، اس تعلق کی ایک اہم وجہ تجارت تھی، ہندوستان سے کئی قسم کے مسالے اور خوشبوئیں عرب درآمد کی جاتی تھیں۔ یہ وہ خوشبوئیں تھیں جن کا ذکر اوپر تفسیر میں کیا گیا ہے۔

ہم نے اسلامی روایات پڑھیں کہ خدا نے آدم اور حوا کی تخلیق کی اور پھر آدم کو ہند میں اور حوا کو جدہ میں اتارا۔ اس کے بعد حوا کو ڈھوڈھتے ہوئے آدم جدہ پہنچے اور پھر وہ زمین کی ناف پر یعنی کعبہ کی جگہ پہنچے جہاں آدم علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا۔

اس کے بعد آدم علیہ السلام دوبارہ ہند آ گئے۔ اس طرح ہندوستان سے لے کر مکہ تک جو سفر آدم علیہ السلام یعنی (ہندو اصطلاح کے مطابق) سویمبھو منو نے کیے، اس کی وجہ سے یہ مکمل راستہ آباد ہوتا چلا گیا۔ ان کے بعد بھی ان کی اولادوں سے یہ خطہ مزید آباد ہوتا چلا گیا ور یہاں سے لوگ مختلف وجوہات سے زمین کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلتے چلے گئے۔

ہندوستان کے اکثر قدیم خطے مثلاً وادی سندھ کی تہذیب کے متعلق آثار قدیمہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہاں لوگوں کو جلایا بھی جاتا تھا اور دفنایا بھی جاتا تھا۔ جن میں سے بعض اس قسم کی ہیں

جن میں سامان زندگی کو بھی ساتھ دفنایا گیا اور بعض قبریں ایسی بھی ہیں جن میں اس قسم کی کوئی شے نہیں ملتی۔ ہم جانتے ہیں کہ سوائے چند فرقوں کے بحیثیت مجموعی ہندوؤں میں تدفین کا رواج نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے مردوں کو جلا دیتے ہیں۔ میت جلانے کا یہ دستور ہندوؤں میں نیا نہیں بلکہ کافی قدیم ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں ہندوستان کے مختلف خطوں سے قبروں کے آثار ملتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اسلامی روایات بتاتی ہیں کہ سب سے پہلے دفن ہونے والے انسان حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہی تھی اور پھر دفنانے کا رواج اسلام میں ہی سبھی شریعتوں کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ نیز ہمیں ہندوؤں کی مقدس کتاب وید میں بھی قبر کا ذکر ملتا ہے۔ وید کے ان منتروں میں مردوں کا دفن ہونا اور اس کے ساتھ عذاب قبر کا تصور بھی واضح ہے۔

> تجھے ہم زمین ماتا کے سپرد کرتے ہیں جو کہ وسیع مہربان اور بخشش کرنے والی ہے۔ زمین کی دیوی سخی کے ساتھ نرمی کا سلوک کرے۔ وہ تجھے نرگ (دوزخ) سے محفوظ رکھے۔ اے زمین! خود کو اوپر اٹھائے رکھ۔ نیچے کی طرف زیادہ بوجھ مت دبا۔ اس (میت) کے لیے آسانی مہیا کر۔ اے زمین آرام سے اس کی حفاظت کرتے ہوئے اس کو ڈھانپ لے۔ جیسے ماں اپنے بچے کے گرد کپڑا لپیٹ لیتی ہے۔ اے زمین ٹھہر جا! اس کے لیے ہزار رحمتوں کا گھر بن جا۔ میں تمہاری جانب مٹی کا ڈھیر لگاتا ہوں۔ تمہارے اوپر پتھر ڈالتا ہوں۔ میں کسی چوٹ سے محفوظ رہوں۔ (رگ وید: منڈل 10، سوکت 2۔ منتر 13-10)

مذکورہ روایات جو تفسیر میں بیان کی گئی ہیں ضعیف ہو سکتی ہیں لیکن دنیا کے کسی اور خطے میں ایسے

دعوے کی روایت بھی ہمیں نہیں ملتی اور پھر دیگر شواہد بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام ہند میں اترے۔اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلی وحی سرزمین ہند میں اتری اور دنیا میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اہل ہند کے ہی پیغمبر تھے۔

ستیا، تیترا اور دواپر یگ

نسل انسانیت کے اولین دور کو ہندو "ستیا یُگ" کہتے ہیں۔ ست معنی حق اور یُگ سنسکرت میں دور یا زمانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہندو منابعات کے مطابق یہ ایک سنہری دور تھا، جب لوگ صحیح اعمال اور راستے پر تھے۔اس کے بعد آہستہ آہستہ برائی بڑھنے لگتی ہے اور اگلا دور "تیترا یُگ" شروع ہوتا ہے جس میں رام چند، ومنا اور پرشورام دنیا میں آئے۔اس کے بعد کا دور "دواپر یگ" کہلاتا ہے۔ جس میں برائی اور بھلائی برابر ہو جاتی ہے۔ اندازوں کے علاوہ تاریخی اعتبار سے ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ دور کب سے کب تک رہے۔

اگر ان دونوں زمانوں کے حالات ذہن میں رکھتے ہوئے بخاری شریف کی یہ حدیث پڑھیں جو ابن کثیر نے قصص الانبیاء میں بھی نقل ہے تو ان زمانوں کے بارے میں کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

صحیح بخاری حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا حضرت آدمؑ اور

نوحؑ کے درمیان دس زمانے تھے اور سب اسلام پر تھے۔[1]

یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ حضرت آدم اور نوحؑ کے درمیان بھی چند پیغمبر گزرے ہیں۔ ستیا یُگ کا سنہرا دور اور اسلام کا دور دورہ ہونا دونوں ایک ہی مفہوم بیان کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ہندوؤں کے مطابق "کلیوگ" شروع ہوتا ہے جو کہ اب تک چل رہا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام

انسانوں کی ہدایت کے لیے جو انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں مبعوث ہوئے ان میں سے ایک جلیل القدر نبی حضرت نوح علیہ السلام ہیں جنھیں یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں قومیں نبی برحق مانتی ہیں۔ ابراہیمی مذاہب کے عقائد کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ان کا نسب نامہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔ نوح بن لامک بن متوشلخ بن خنوخ (ادریس) بن یرد بن مہلائیل بن قنین بن انوش بن شیث بن آدم۔ (علیہم السلام)

قرآن مجید، بائبل اور تاریخ میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعث اس وقت ہوئی جب بت پرستی عام ہو چکی تھی اور لوگ شرک و گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ ان سے پہلے کسی بھی نبی کو شریعت نہیں دی گئی

[1] حافظ عمادالدین ابوالفدا اسماعیل ابن کثیر۔ **قصص الانبیاء**۔ اردو ترجمہ: مولانا ابو طلحٰہ اصغر مغل۔ ادارہ دارالاشاعت کراچی۔ صفحہ 83

تھی؛ لہٰذا روئے زمین پر یہ سب سے پہلے صاحب شریعت رسول تھے۔ البتہ ان کی قوم کے بارے میں مقدس صحائف خاموش نظر آتے ہیں، ا[1]سیک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بنوراسب کی طرف مبعوث کیا گیا تھا لیکن اس قوم کے بارے میں بھی ہمیں معلومات میسر نہیں ہو سکیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو کئی برس تبلیغ کی لیکن چند ایک کے علاوہ یہ دعوت حق کسی نے قبول نہ کی، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے بے کسی کے عالم میں بارگاہِ خداوندی میں فریاد کی اور خدا نے انھیں ایک بڑی کشتی بنانے کا حکم دیا اور بتایا کہ زمین پر طوفان کی صورت میں عذاب بھیجا جائے گا؛ لہٰذا تم ایک کشتی بناؤ اور اپنے متبعین (آپ کے پیروی کرنے والوں) کو اس میں سوار کر لو۔

حکم خداوندی کے مطابق انھوں نے کشتی بنائی اور اپنی نیک اولاد حام، سام اور یافث اور ان کی بیویوں کو ساتھ سوار کر لیا۔ پھر زمین پر ایک عظیم طوفان آیا جس میں وہ نافرمان مخلوق غرق ہو گئی اور صرف نیک لوگ کشتی میں محفوظ رہے۔

طوفان کی ابتدا کے بارے میں قرآن مجید آتا ہے کہ تنور سے پانی ابلنا شروع ہوا اور طوفان کی

[1] ایضاً۔ ص84

ابتدا ہوئی۔[1] اس تنور کے بارے میں علما کرام کی مختلف رائے ہیں۔ ایک مقبول روایت کے مطابق مسجد کوفہ کے ایک گوشے میں وہ مقام تنور موجود ہے جہاں سے طوفان نوحؑ کا آغاز ہوا تھا۔ مولانا نعیم الدین مراد آبادی (1887-1948) نے اپنی تفسیر خزائن العرفان میں لکھا ہے کہ یہ حضرت حوا کا تنور تھا جو ترکے میں آپ تک پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور قول جسے فتح القدیر[2] میں علامہ شوکانی نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ تنور ایک مقام ہے جو ہند میں ہے۔ یہ قصبہ جنوبی ہند کیرالہ میں ملپ پورم ضلع میں واقع ہے۔

طوفان اٹھنے کے بعد کشتی روانہ ہوگئی اور طوفان کے بعد کوہِ ارارات پر رکی جو کہ ترکی میں ہے۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گئی۔ چنانچہ آج دنیا میں انہی کی نسل موجود ہے۔

ہندو قوم اور حضرت نوح علیہ السلام[3]

اسلامی عقیدے کے مطابق قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ توریت

---

[1] قرآن مجید۔ سورۃ ہود۔ آیت 40

[2] جلد 2، صفحہ 474

[3] **نوٹ:** اس موضوع پر مولانا شمس نوید عثمانی کی خاصی تحقیقی کتب موجود ہیں۔ میں نے یہاں انھی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے خلاصہ بیان کیا ہے، البتہ جن نکات سے اختلاف ہے اسے چھوڑ دیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر۔ ان کتابوں کے ماننے والے ابراہیم مذاہب کا دعویٰ ہے کہ یہ الہامی ہیں اور ہم ان کے انبیاء کرامؑ کو جانتے ہیں۔ ہندوؤں کا بھی دعویٰ ہے کہ وید الہامی کتاب ہے جو مختلف زمانے میں رشیوں پر نازل ہوئی چنانچہ ہنود ابراہیم مذاہب کے کسی بھی پیغمبر کو نہیں مانتے۔ مذاہب عالم کی جھرمٹ میں یہ وہ واحد مذہبی قوم ہے جس کا نبی کھویا ہوا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی طرف کوئی نبی نہیں آیا۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حدیث پڑھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> قیامت کے دن حضرت نوحؑ کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا انھوں نے اپنی امت کو احکام خداوندی پہنچائے تھے؟ وہ عرض کریں گے بے شک اے میرے پروردگار! پھر نوحؑ کی امت سے پوچھا جائے گا کہ نوحؑ نے تم تک ہمارے احکام پہنچائے تھے؟ وہ لوگ انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ پھر حضرت نوحؑ سے پوچھا جائے گا: کہ تمھارے گواہ کون ہیں؟ وہ کہیں گے میرے گواہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے لوگ ہیں۔ (بخاری)

ایک طرف ہم جانتے ہیں کہ ہندو قوم کا نبی کھویا ہوا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی طرف کوئی نبی نہیں آیا اور دوسری طرف یہ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت انھیں پہچاننے سے انکار کر دے گی' اور یہ کہے گی کہ ان کی طرف کوئی نبی نہیں آیا۔ کیا یہ قوم ہندو نہیں؟ فی الحال ہمارا یہ قیاس اگرچہ بہت کمزور ہے لیکن اب کچھ مزید نکات زیر غور لائیں۔

گزشتہ اوراق میں ہم نے پڑھا کہ اسلامی روایات کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے صاحب شریعت رسول تھے، اور اولین مقدس کتابوں کے لیے قرآن مجید میں "صحف اولیٰ" اور "زبر الاولین" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔یعنی حضرت نوح علیہ السلام پر نازل ہونے والا صحیفہ یا کتاب "صحف اولیٰ" اور "زبر الاولین" ہی ہے۔

اس حقیقت کی دوسری جانب ہمارے سامنے دمورخین اور ہندوؤں کی جانب سے یہ دعویٰ بھی ہے کہ ان کا مذہب اور ان کی مقدس کتابیں دنیا کی اولین مذہبی کتابیں ہیں اسی لیے ہنود اپنے مقدس صحائف کو "آدگرنتھ" اور "آدِگیان" کہتے ہیں۔یہ امر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہندوؤں کی مقدس کتاب وید اور پران جنھیں وہ "آدگرنتھ" اور "آدِگیان" کہتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے صحائف ہیں کیونکہ سنسکرت کے ان دونوں لفظوں کے معنی وہی ہیں جو قرآن میں "صحف اولیٰ" اور "زبر الاولین" کے ہیں۔مشہور عالم و محقق ڈاکٹر حمید اللہ (1908-2002) زبر الاولین کے حوالے سے "پران" کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔[1]

قرآن مجید کی گواہی کے بعد اب ہم تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے مطابق قدیم ہندوستانی قوم حضرت نوحؑ کے بیٹے حام اور آریائی اور بحر روم سے آنے والے لوگ یافث کی نسل سے ہیں۔اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سوالوں پر معمولی سا غور کریں کہ کیا حضرت نو

[1] ۔دیکھیں:ڈاکٹر حمید اللہ۔خطباتِ بہاولپور۔

ح علیہ السلام کی ان نیک اولادوں سے ہونی والی نسل اپنے والد کو عطا کی جانے والی شریعت سے بے خبر تھی؟ کیا یافث، حام اور سام نے اپنی اولادوں کو قصہ نوحؑ نہیں بتایا ہو گا؟ کیا انھوں نے اپنی اولادوں کو اُس دین حق کی دعوت نہیں دی ہو گی جس پر ان کے والد نوح علیہ السلام تھے؟

ہماری عقل، ہمارا قلب اور ہمارا ایمان یہی جواب دیتا ہے یقینا اولاد نوحؑ کی نسل یعنی ہندوؤں کو اپنے والد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی صالح اولادوں سے دین حق کی دعوت ملی ہو گی اور انھیں اس طوفان کا بخوبی علم ہو گا۔ شواہد کے طور پر ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں آج بھی طوفان نوحؑ کا ذکر موجود ہے۔

طوفانِ نوح اور ہنود

تاریخ انسانی میں یہ عظیم الشان واقعہ دنیا بھر میں کسی نہ کسی صورت پایا جاتا ہے۔ جاوا، ملائشیا، انڈونیشیا اور دیگر ممالک کے لوگوں نے اپنی لوک داستانوں اور گیتوں کے ذریعے آج بھی اس واقعے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ زبان کی تبدیلی اور ایک طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے اگرچہ آج اس واقعے کے متعلق ہمیں ان میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ہر جگہ مفہوم ایک ہی ہے۔ ہندو دھرم میں یہی واقعہ جل پرلی اور منو کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ منو کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ہندوؤں کے نزدیک ایک ایسی ہستی کو کہا جاتا ہے جس سے نسل جاری ہوئی ۔ پرانوں میں جن منو کا ذکر ہے ان میں سے ایک منو کا نام "متسیہ" ہے۔ پران، وید اور دوسری

کتابوں میں جس منو کا مفصل ذکر ہے وہ منو غالباً حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور منو کے بیٹوں کے متعلق یہ مماثلت بھی قابل غور ہے کہ بائبل کتاب پیدائش[1] کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کاریگر تھے جنہوں ایسا برج بنانے کا ارادہ کیا جو آسمان تک پہنچ جائے۔ یہی بات ویدک رشی منو کے بیٹوں کے بارے میں ہمیں رگ وید[2] میں ملتی ہے کہ منو کے بیٹے "رِبھو" بہترین کاریگر تھے۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک بیٹے کو عاق کر دیا تھا، اور منو نے بھی اپنے ایک بیٹے "**نبیہید نیدشٹا**" کو عاق کر دیا تھا۔

معروف فرانسیسی مصنف دیوبائیس (J.A Dubois:1746-1848) جنہوں نے چالیس سال تک ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ کیا اور ہندو رسم و رواج پر سب سے مستند اور ضخیم کتاب لکھی۔ اپنی کتاب Hindu Manners,Costoms & Cermonies میں منو کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ایک مشہور شخصیت جو کہ ہندوؤں کے یہاں بہت مقدس ہے اور جسے وہ "مہانووو" (Mahanuvu) کے نام سے جانتے ہیں۔ (سیلاب کی) تباہی سے ایک کشتی کے ذریعے بچ نکلی جس میں سات مشہور رشی سوار تھے۔ "مہانووو" دو لفظوں مہا اور نوو کا مرکب ہے۔ مہا کے معنی

[1] باب 11۔ آیت 4

[2] منڈل 3۔ سوکت 60۔ منتر 3

عظیم اور نو وبلاشک وشبہ نوحؑ ہیں۔[1]

ہنود نوحؑ کو منو کے نام سے جانتے ہیں اور طوفان نوحؑ کے واقعے کو ہنود "جل پرلیاون" یعنی پانی کا عظیم سیلاب کہتے ہیں۔ ویدوں میں بھی ہمیں کئی مقامات پر کشتی نوحؑ اور طوفان کا ذکر ملتا ہے۔

اس اسر نے تین بلندیوں کو قابو کرنے کے لیے صداقت کی کشتی بنائی ہے جو اعمال صالحہ کرنے والوں کو پار لگاتی ہے۔(رگ وید: منڈل 9۔ سوکت 73۔ منتر 1)

چونکہ ہم نے اندر کے لیے تحائف پیش کیے ہیں سو ہم اس کی طرف چڑھیں گے گویا امن وسلامتی (اسلام) کی کشتی پر دور دور تک پھیلے ہوئے وسیع جہانوں کی مانند ہم دونوں وقت سلامتی میں ہو۔(رگ وید: منڈل 10۔ سوکت 178۔ منتر 2)

متسیہ پران میں اس سیلاب کے بارے میں ہے:

تب بھگوان منو سے یوں بولے، ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ اے زمین کے رکھوالے! تھوڑے ہی عرصے میں پہاڑ، جنگل اور کونوں سمیت یہ زمین پانی میں ڈوب جائے گی؛ اس لیے اے زمین کے سردار! تمام جانداروں کی حفاظت کرنے کے لیے تمام دیوتاؤں کے ذریعے اس کشتی کو تعمیر کیا گیا ہے۔ اے وفا شعار بندے! جتنے بھی قسم کے جاندار ہیں ان سبھی بے سہاروں کو اس کشتی میں چڑھا کر تم ان سب کی حفاظت کرنا۔(متسیہ پران۔ ادھیائے 1۔ اشلوک 35-29)

[1] Abbe J.A Dubois, ***Hindu Manners, Costoms & Cermonies.*** 3rd Edition. (Oxford: The Clarendon Press, 1960) P.48

بھوشیہ پران میں اس واقعے کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وشنو کا بندہ دھیان میں محو تھا۔ ایک بار وشنو نے اسے خواب میں بتایا کہ اے پیارے نوحؑ سنو! ساتویں دن حشر برپا ہو گا۔ تم لوگوں کے ساتھ کشتی میں فوراً بیٹھ جانا۔ اے اندر کے بھگت! اپنی جان بچاؤ۔ تم سربلند ہوگے۔ اس طرح مان کر اس بزرگ ہستی نے تین سو ہاتھ لمبی پچاس ہاتھ چوڑی اور تین ہزار ہاتھ گہری خوب صورت کشتی ایجاد کی۔ سبھی جانداروں کے جوڑوں اور اپنے اہل خاندان کے ساتھ سوار ہو کر وشنو کے دھیان میں محو ہو گیا۔۔۔ چالیس دن تک زبردست بارش ہوئی۔ بھارت ورش پانی سے ڈوب گیا اور چار سمندر مل گئے اور بیکراں ہو گئے۔۔ نوح اپنے اہل خاندان کے ساتھ طوفان ختم ہونے پر وہاں رہنے لگا۔ نوح کے بیٹے سام، حام، اور یاقوت نام سے مشہور ہوئے۔ (بھوشیہ پران۔ پرتی سگ پرو۔4۔ اشلوک 60-45)

ان اشلوکوں میں اصل سنسکرت میں نوح کی جگہ نیوح، سام کی جگہ سِم استعمال ہوا ہے۔ یجروید کی تفسیر شت پتھ برہمن[1] میں طوفان نوح کے حوالے سے مزید تفصیل ہے۔ آخر میں ایک اہم ترین شہادت ہندوؤں کا حضرت نوحؑ سے تعلق کے حوالے سے یہ ہے کہ اکثر قومیں اپنا کیلنڈر کسی مذہبی روایت سے شروع کرتی ہے۔ مثلاً مسلمان ہجرت نبوی سے، عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدائش سے۔ ہنود اپنے موجودہ عہد کلیوگ کو اس عظیم واقعے "جل پرلیاون" سے منسوب کرتے ہیں اس کے بعد سے ہر ساٹھ سال کے وقفے کو ایک سال مانتے ہیں۔

[1] ادھیائے 7۔ برہمن 1

-

بھوشیہ پران کی تاریخ

بھوشیہ پران ہندوؤں کی ان مقدس کتب میں سے ہے جس میں تاریخ بیان کی گئی ہے۔ البتہ اس پران میں تاریخ نہیں بلکہ مستقبل کا بیان ہے۔ اس پران میں بہت سے بادشاہوں اور مستقبل کے حالات کی خبر ملتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس پران کا تعلق شاک دویپہ برہمن یعنی برہمنوں کی اس ذات سے ہے جن کے اجداد ایران میں "مید" سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ اسی وجہ سے ہمیں سورج کی پرستش کرنے کے طریقے بھی اس کتاب میں ملتے ہیں جبکہ ایک باب خوابوں کی تعبیر یعنی علم الرویا سے بھی متعلق ہے۔ آج کل یہ پران اس وجہ سے کافی متنازع رہی ہے کہ اس میں ہمیں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک، اور دیگر مذاہب کے کچھ پیغمبر مثلاً زرتشت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نیز اس پران میں برطانوی سامراج اور ملکہ وکٹوریہ کے متعلق بھی پیشن گوئی ملتی ہے۔

اگرچہ اس پران کا ذکر ہمیں دیگر پرانوں مثلاً وایو پران میں بھی ملتا ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ یہ پران کسی بعد کے دور کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ قدیم زمانے سے ہی ہندو لٹریچر کا حصہ رہی ہے، اس کی تاریخ 500BC یا اس کے کچھ بعد قرار دی جاسکتی ہے، البتہ اسے اپنی موجودہ صورت کئی اضافوں کے بعد حال ہی میں ملی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت بھی یہ ہے کہ اس پران میں ابراہیمی اور غیر ہندی مذاہب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں سنسکرت کے بجائے عربی اور فارسی اصطلاحات ہی استعمال کی گئیں ہیں۔

باب 9: انتم اوتار اور محمد ﷺ

حضرت محمد ﷺ اور ہندوؤں مقدس کتابیں

اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعے سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے ’پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس (کتاب) ہے تو تمھیں اس پر ضرور ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔ کہا، کیا تم اقرار کرتے ہو اور میرا عہد قبول کرتے ہو؟ انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہا پھر گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ (قرآن مجید۔ سورۃ ال عمران۔ آیت 81)

[1] آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ تمام انبیاء کرامؑ سے اس بات کا سخت عہد و پیمان لیا جا چکا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے اور بالخصوص خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبشر و مصدق ہوں۔ زمانۂ ماضی میں آنے والے ہر پیغمبر نے اپنے بعد آنے والے پیغمبر کی بشارت دی اور بعد میں آنے والے انبیاء کی تصدیق و تائید بھی کی۔ آخری نبی کے متعلق یہ بھی بتایا گیا وہ

[1] یہ مضمون مصنف کی گزشتہ کتاب ”ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ“ میں لکھا گیا تھا، یہاں اسے کچھ اضافوں اور ترمیم کے ساتھ دوبارہ نقل کیا جارہا ہے۔ نیز یہ مضمون وید پرکاش اپدھیائے کی کتاب ”کلکی اور محمد ﷺ“، مولانا شمس نوید کی ہندی کتاب ”قرآن اور وید کتنے دور کتنے پاس“ اور مصنف کی ذاتی تحقیق سے تیار کیا گیا ہے۔

کتبِ سابقہ کی تصدیق کریں گے؛ اور اس کا ذکر تمام انبیاء کی کتابوں کی آچکا ہے۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق سے لے کر مغرب تک جتنے بھی مذاہب پائے جاتے ہیں ان کی کتب میں پیشگوئیاں ، بشارات اور آخری نبی و شریعت کی صفات درج ہیں۔ قرآن مجید اس بات کی مزید تصدیق اس طرح کرتا ہے۔

اور بے شک یہ پہلوں کی کتابوں میں بھی ہے۔(سورۃ الشعراء: آیت196)

وہ لوگ جو اس رسول امی پر کی پیروی کرتے ہیں، جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل (کتبِ مقدسہ) میں لکھا پاتے ہیں۔ وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے۔ چنانچہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا' وہی فلاح پانے والے ہیں۔(سورۃ الاعراف: آیت157)

اوپر ہم اس بات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ سرزمین ہند بھی وحی کے نور سے منور ہوئی ہے، اور ان قوموں تک ان کے پیغمبروں نے اتمام حجت کر دیا ہے؛ لہٰذا اس سلسلے میں سب سے آخری اور اہم گواہی ہمارے سامنے ہنود کی مقدس کتابوں میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی ہے۔

عقیدہ اوتار کے تحت ہم یہ بات پڑھ آئے ہیں کہ ہندوؤں کے مطابق دنیا میں بدکاروں کے

خاتمے اور برائی کی بیخ کنی کے لیے کئی اوتار دنیا میں تشریف لائے۔ جن کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ دس مشہور اوتار واضح طور پر وید، پران اور مہابھارت وغیرہ میں مذکور ہیں جن کے نام ہم نے درج بھی کیے۔ ان اوتاروں میں سے آخری اوتار کلکی ہے جس کے متعلق ہنود کا اعتقاد ہے یہ اوتار مستقبل میں آئے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلکی اوتار کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ مسلمانوں کے ہاں پیغمبر کا ہے۔ مسلمان حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری پیغمبر مانتے ہیں۔ اور ہندو قدیم زمانے سے کلکی کو آخری اوتار مانتے ہیں۔ اگرچہ اوتار سے مراد ہندوؤں کا نزدیک خدا کی تجسیم ہے۔ لیکن کلکی کے متعلق صورتِ عقیدہ ذرا مختلف ہے۔ جو کہ بہت سے اختلافات کی بھی زد میں ہے۔

لفظ اوتار کے ایک معنی زمین پر خدا کا پیغام پہنچانے والا یعنی پیغمبر بھی ہے اور اس کی تصدیق بہت سے علما سنسکرت بھی کرتے ہیں، اور چونکہ ہندو مذہب میں رائج کتابوں میں دست انسانی کی کار فرمائی موجود ہے؛ لہٰذا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی دور میں کلکی اور بقیہ اوتار کی حیثیت بھی پیغمبر کی ہو، لیکن بعد ازاں کتب مقدسہ میں تحریف و تبدل کرنے والے مصنفین اور برہمنوں نے انھیں خدائی مقام دے دیا ہو۔ جیسا کہ عیسائیت میں مسیح کے ساتھ ہوا کہ خدا کا پیغام پہنچانے والے نبی کو ہی خدا ٹھہرا دیا گیا ہے؛ لہٰذا ہندومت جو کہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے، اس کے ساتھ بھی ایسا واقعہ ہونا محال معلوم نہیں ہوتا۔ جب کہ حقیقت یہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ

مستقبل میں آنے والے خدا کے کسی فرستادے کا تصور دنیا کے ہر قدیم مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے۔

بہر کیف ہندوؤں کے ہزاروں سال قدیم ادبیات کے مطابق کلکی اوتار کا ظہور مستقبل میں ہو گا۔ لیکن چونکہ یہ کتابیں نہایت قدیم ہیں تو کوئی شک نہیں کہ کلکی کے ظہور کا دور گزر چکا ہے، اور کلکی بھی دنیا میں آچکا ہو۔ پرانوں کے مطابق کلکی کی پیدائش کا زمانہ "کلیوگ" ہے جس کا آغاز ہندو کیلنڈر کے مطابق لگ بھگ 5000 برس پہلے ہوا تھا اور یہ زمانہ تاحال جاری ہے۔

قارئین کے سامنے یہ یہ واضح رہنا چاہیے کہ کلکی درحقیقت کوئی نام نہیں بلکہ اس انتم رشی یا اوتار کی پہچان ہے۔ لفظ کلکی سنسکرت لفظ کلکا سے بنا ہے جس کے معنی نجاست، تاریکی، گندگی، یا انتشار کے ہیں۔ چنانچہ کلکی کے معنی انتشار، نجاست، تاریکی وغیرہ ختم کرنے والا ہے۔ سوامی امر جیوتی اپنے ایک مضمون[1] میں کلکی کے معنی "آہنی" لکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ کلکی آہنی جسم کا مالک یا کوئی روبوٹ ہو گا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا تعلق اس دور سے ہو گا جس میں لوہے کا استعمال عام ہو۔

ویدوں اور پران میں مستقبل میں آنے والے اس انتم رشی کا نام نراشنساہ بتایا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اسے دوسرے مختلف ناموں سے بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ ہندو علما کے نزدیک نراشنساہ اب

[1] Editor's Choice: www.adishakti.com

تک ایک پر اسرار شخصیت بنی رہی تھی۔ کیونکہ نراشنساہ کی جو صفات اور اس کے بارے میں جو تفصیلات ان مذہبی کتابوں میں ملتی ہیں اس کے مطابق ہندو علما اس شخصیت کو کلیوگ دور کی کسی شخصیت یا دیوتا سے نہیں جوڑ سکے۔ علاویں ازیں کلکی کے متعلق پران اور وید میں بہت سی افسانوی باتیں بھی ہیں۔ تاہم لفظ نراشنس سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بشر کا ذکر ہے کیونکہ سنسکرت لفظ نراشنس میں "نرا" کے معنی شخص ہوتے ہیں جو کہ انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اگر ہم مبالغہ آرائیوں اور افسانوی باتوں میں سے حقیقت کی تلاش کرتے ہوئے بلا کسی تعصب ان اقتباسات پر غور کریں اور کلکی کی شخصی صفات کی تحقیق کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندو کتابوں میں مذکور کلکی اور اہل اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم دو مختلف شخصیات نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہے۔ اب ہم پرانوں اور ویدوں میں مذکور ایک مقدس ہستی کی صفات اور حضرت محمد کی صفات وحیاتِ طیبہ میں مماثلت کا جائزہ لیں گے۔

رگ وید میں ذکر مبارک

یہ بات یقیناہنود کے خواص علما کے لیے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ان کی مقدس کتاب وید، اپنشد اور پرانوں میں جس مہاپرش کی آمد کی اطلاع دی گئی ہے، وہ بلاشک وشبہ ایسی ہستی ہے جو دنیا میں انقلاب برپا کرے ہے۔ اور معمولی غور و فکر سے حقیقت سامنے آتی جاتی ہے کہ یہ مقدس ہستی کون

ہے۔ ان کتابوں میں اس کا نام "نراشنس" کہا گیا ہے۔ رگ وید میں مستقبل کے اس عظیم پیغمبر کے متعلق نراشنس کے نام سے 16 جگہ ذکر ملتا ہے۔:

میں نے نراشنس کو دیکھا ہے۔ سب سے زیادہ اولوالعزم اور سب سے زیادہ مشہور جیسا کہ وہ جنت میں ہر ایک کے پیغمبر تھے۔(رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 18۔ منتر 9)

اے نراشنس! شیریں زبان والے، قربانیاں دینے والے۔ میں آپ کی قربانیوں کو وسیلہ بناتا ہوں۔(رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 13۔ منتر 3)

عظیم نراشنس کی قوت میں اضافہ کے لیے پشان، جو کہ ایک عظیم حکمراں ہے، اس کے لیے ہم نعت بیان کرتے ہیں۔(رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 106۔ منتر 4)

نراشنس سنسکرت میں "نر" اور "اشنسا" کا مصدر ہے۔ نر کے معنی "شخص" کے ہیں اور "اشنسا" کے معنی "تعریف یا ثنا" ہیں۔ یعنی نراشنسا سے مراد ہے، "وہ جس کی تعریف کی گئی"۔ ویدوں کے مشہور مفسر سائن اچاریہ نے بھی اپنی رگ وید بھاشیہ سنہتا میں نراشنس کے معنی "انسانوں کے ذریعے تعریف کیا گیا" بتایا ہے۔ یہی معنی عربی میں "محمد" کے ہیں۔ یعنی لفظ نراشنس کا عربی ترجمہ "محمد" ہے۔ ہندوؤں میں بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ نراشنس کسی دیوتا کا نام ہے لیکن یہ نام دیوتا کا ہونا ہرگز نہیں ممکن نہیں کیونکہ سنسکرت میں لفظ "نر" انسان کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔

رگ وید کے آٹھویں منڈل میں اس پیغمبر کا صفاتی نام "احمد" لکھا ہے۔

احمد نے سب سے پہلے قربانی دی اور سورج جیسا ہو گیا۔ (رگ وید: منڈل 8۔ سوکت 6۔ منتر 9-10)

یہاں سنسکرت عبارتوں میں بھی احمد لفظ ہی لکھا ہے۔ د کی جگہ ت لکھا ہے کیونکہ سنسکرت د کی جگہ ت استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اکثر ترجمہ اہم اور ات الگ الگ کیا جاتا ہے جس سے ترجمے میں فرق آجاتا ہے۔

ہمیں رگ وید میں اگنی کے نام سے ایک پیغمبر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اگر ہم اگنی کے معنی ہر جگہ ایک ہی لیں؛ اور اسے ایک ہی ہستی مان کر ویدوں کا مطالعہ کریں تو پھر اگنی ایک معمّا بن کر رہ جاتی ہے ۔ کیونکہ پورے وید میں اسے ایک معبود کی حیثیت سے پیش کیا گیا لیکن کہیں کہیں اسے خدا سے تعلق جوڑنے اور قربانی (یگیہ خدا تک پہنچانے والے) ایک پیغمبر کی حیثیت سے بھی پیش کیا گیا ہے۔

اگنی کی حمد ہو جو منتخب کیا گیا پروہت (مذہبی رہنما) ہے۔ (رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 1۔ منت 1)

ہم نے اگنی کو اپنا قاصد اور پیغمبر منتخب کیا۔ (رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 12۔ منتر 1)

(اے اگنی) تجھے ہم نے پیغمبر منتخب کیا۔ تجھ عالم الغیب کو اپنا عبادت گذار بنایا۔ تیری (حکمت کے) شعلے طول و عرض تک پھیلیں گے۔ تیری ضیا آسمان تک پہنچے گی۔ (رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 36۔ منتر 3)

اس کے علاوہ بھی اگنی کو کئی مقامات پر پیغمبر بتایا گیا ہے۔ اسماء الحسنیٰ (اللہ کے نام) اور محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے ناموں سے واقف حضرات کے لیے ناموں میں مماثلت کوئی پریشان کن بات نہیں کیونکہ اس طرح کا انداز قرآن مجید میں بھی ہمیں ملتا ہے۔ رؤف ورحیم اللہ کے اپنے نام ہیں لیکن قرآن مجید[1] میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہ نام یہی رؤف ورحیم بتایا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگنی ویدوں کے مطابق معبود ہستی ہی ہے لیکن وید میں مذکور ایک پیغمبر کو بھی اگنی کا لقب دیا گیا ہے۔ رگ وید کے منتر میں جہاں اسے اگنی کہا گیا ہے اس کی جگہ الہ کا مقدس گھر بتایا گیا ہے۔ یاد رہے کہ الہٰ ویدوں میں ایک خاص مونث دیوی کا نام ہے۔

> اگنی نے تجھے دعاؤں کے ساتھ اپنے گھر میں بھیجا۔ نافِ زمین پر۔ دنیا کے قریب وسط میں۔ (رگ وید: منڈل 1۔ سوکت 143۔ منتر 4)

> اگنی نے جنم لیا۔ وہ سب سے قابل پیغمبر، ایک عظیم اور مقدس کام انجام دینے کے لیے پیدا ہوا جس کے لیے وہ (گزشتہ پیغمبر) بھی اسی طرح سرگرم رہے۔ لیکن حقیقت میں وہ خود سے منسوب ایک مقدس عمل کے لیے پیدا ہوا ہے۔ تمام ساعتیں اس طرف اس کی محبت اور خیر خواہی کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ وہ پیغمبر کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ وہ مقامِ الہٰ میں ہے۔ (رگ وید :منڈل 1۔ سوکت 128۔ منتر 1)

مقام کے ساتھ یہاں رگ وید کے منتر سے ایک اور بات بھی واضح ہوئی کہ حضرت محمد صلی اللہ

[1] سورۃ التوبہ: آیت 128

علیہ وسلم کسی نئے کام کے لیے مبعوث نہیں ہوئے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہی پیغام ہے جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی وہ تعلیمات تھیں جو گزشتہ انبیاءؑ کی تھیں۔ قرآن میں واضح طور پر خدا فرماتا ہے:

اور ہم نے آپ سے قبل کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔ (سورۃ الانبیاء: آیت 25)

مقرر کیا وہی تمہارے لیے دین جس کا حکم کیا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو۔ (سورۃ شوریٰ: آیت 13)

اس آیت میں خود سے منسوب ایک مشن کا اشارہ غالباً خدا کی حمد اور بڑائی کے لیے کیا گیا ہے۔ بہر حال الہ کا مقدس مقام کہاں ہے؟ اس بارے میں رگ وید میں ہے۔

"ہم نے تجھے نافِ زمین میں مقام الہٰ میں نازل کیا۔ (رگ وید: منڈل 3۔29۔4)

اس منتر کے متعلق ایک اور بات قابل غور ہے کہ اس منتر کے بعد نراشنش کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے نرشنس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور مقام الہ کا کعبہ ہونے کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ زمین کی ناف یعنی مرکزی حصے سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے اس کا تعلق مکہ سے ہے۔ مکہ کو ام القریٰ یعنی آبادیوں کی ماں بھی کہا جاتا ہے اور زمین کے درمیان کے قریب بھی ہے۔ کیونکہ ناف بھی جسم کے بالکل وسط میں نہیں ہوتی۔ یہ زمین پر خدا کی عبادت کے لیے بنائے جانے والا سب سے پہلا گھر ہے۔ اسی لیے اسے بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر بھی کہا جاتا ہے۔ غالباً لفظ الہٰ اسلامی نام

-

اللہ ہی ہے۔ جسے وید میں الہ کہا گیا ہو اور پھر یہ حرف اور اس کے متعلق عقیدہ میں بگاڑ آ گیا ہو۔ عربی میں بھی خدا کو الہ کہا جاتا ہے اور اگر ہم مقامِ الہ کا عربی میں ترجمہ کریں تو بیت اللہ بنتا ہے۔

اوصاف حمیدہ

چونکہ مستقبل کے اس عظیم پیغمبر کی پہچان صحیح طرح کرانا انتہائی اہم تھا؛ اس لیے ویدوں میں صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی نہیں بلکہ آپ کے اہم ترین اوصاف حمیدہ کا بھی ذکر کر دیا گیا۔ رگ وید میں نراشنس کی درج ذیل صفات بھی آئی ہیں۔

لفظ	معنی	حوالہ
مدھوجہوا	شیریں کلام کرنے والا	منڈل 1۔ سوکت 13۔ منتر 3
کوی	غیب کی خبر دینے والا	منڈل 5۔ سوکت۔2 منتر 2
سورچی	پُرنور	منڈل 2۔ سوکت 3۔ منتر 2

سیرت النبی صلی اللہ علیہ کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ تینوں صفات کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری اترتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مقام

ویدوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تین حیثیتوں کا بھی ذکر ہے۔ یہ مراتب احمد، محمد اور محمود ہیں۔ آسمان میں آپ کا نام احمد، زمین پہ محمد اور آخرت میں آپ محمود ہوں گے۔ حدیث مبارکہ میں "احمد" اور "محمد" کے بارے میں ہے:

انا محمد و احمد (المختصر)

میں محمد ہوں اور احمد ہوں۔ (صحیح مسلم شریف۔ کتاب الفضائل)

احمد کے بارے میں قرآن مجید میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے کہ:

میں ایک رسول کی خوش خبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا (اور) اس کا نام احمد ہو گا۔ (سورۃ الصف: آیت 6)

تیسرا مقام یعنی "مقام محمود" کے بارے میں علما کرام لکھتے ہیں کہ مقام محمود ایک خاص مقام ہے جہاں آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فائز کیا جائے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کی شفاعت کریں گے اور سب آپ کی حمد کریں گے۔ قرآن مجید میں اس مقام کے بارے میں ہے:

یقینا آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ (سورۃ بنی اسرائیل: آیت 79)

ر ِگ وید میں ان تینوں مراتب کا ذکر یوں ہے:

اگنی کا پہلا ظہور سورگ لوک (دنیائے آسمان) میں نور کی صورت میں ہوا، اس کا دوسرا ظہور ہم انسانوں کے درمیان ہوا۔ تب وہ جات وید (یعنی وید کے ہوتے ہی علم رکھنے والے) کہلائے۔ اس کا تیسرا ظہور جلن (روحانی دنیا) میں ہوا۔ (رگ وید: منڈل 10۔ سوکت 45۔ منتر 1)

اے اگنی! ہم تمہارے تینوں روپوں کو جانتے ہیں۔ جہاں جہاں تمہارا ٹھکانہ تھا، ان مقامات کو بھی جانتے ہیں۔ ہم تمہارے انتہائی خفیہ نام اور تمہارے پیدا ہونے کے مقام کو بھی جانتے ہیں۔ تم جہاں سے آئے ہو، یہ بھی جانتے ہیں۔ (رگ وید: منڈل 10۔ سوکت 45۔ منتر 2)

اتھر وید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک

اتھر وید کا کانڈ (کتاب) نمبر 20 کی سوکت 127 "کنٹپ سوکت" کہلاتے ہیں۔ یہ منتر ہر سال اہم قربانی کے موقعوں پر پنڈت مل کر دہراتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو قوم کو اسے یاد رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ قابل غور بات ہے کہ یہ سوکت جو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی کے حوالے سے انتہائی اہم ہے، اسے کنٹپ کہتے ہیں۔ کنٹپ کے معنی ہیں امن و سلامتی کا پیغام یا مصائب و آلام کو ختم کرنے والا۔ لفظ کنٹپ کا عربی ترجمہ "اسلام" ہو گا جس کے معنی ہیں امن و سلامتی۔ کنٹپ کے پہلے منتر کا ترجمہ یوں ہے:

اے لوگو! احترام سے سنو! نراشنس تعریف کیا جائے گا، ساٹھ ہزار نوے دشمنوں میں، کورم کو ہم حفاظت میں لیتے ہیں۔

اس منتر میں لفظ کورَما استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "امن قائم کرنے والا"۔ اسی لفظ کے دوسرے معنی "ہجرت کرنے والا" ہے۔ یہ دونوں ہی معنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امن کے سفیر تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت بھی کی۔

نراشنس کے معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ محمد کا سنسکرت ترجمہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہونے کے لیے یہاں سنسکرت میں مستقبل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نراشنس کا ظہور ویدوں کے بہت بعد ہو گا۔

پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک اور واضح نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ اسے ساٹھ ہزار دشمنوں میں بھی محفوظ رکھا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مشرکین مکہ کی آبادی بھی تقریباً ساٹھ ہزار تھی۔ اب اس کے دوسرے منتر میں دو مزید نشانیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سے زائد بیویوں اور اونٹ کی سواری کا ذکر ہے۔

جس کی سواری دو خوب صورت اونٹنیاں ہیں، (یا جو بیویوں سمیت اونٹوں پر سواری کرتا ہے)
اس کے مرتبہ اور مرکب کی بلندی اپنی تیز روی سے آسمان کو مس کر کے نیچے اترتی ہے۔

اس منتر میں خاص لفظ "دِورِدرش" ہے، جس کا ترجمہ دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ دو خوب صورت اونٹنیاں یا بیویوں سمیت اونٹ پر سواری۔ پہلا ترجمہ بھی سیرت نبی کے مطابق ہے،

کیونکہ ہجرت کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو اونٹنیاں تھیں جب کہ دوسرا ترجمہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی کے حق میں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر ازدواج مطہرات کے ساتھ سواری کی ہے۔ اونٹ سوار ہونے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر ہندی ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے کیونکہ ہندوستانی رشیوں کے لیے ازروئے قانون مقدس اونٹ کی سواری منع ہے۔[1]

کنٹپ کے تیسرے منتر میں انتم رشی کو پہچاننے کے لیے کچھ مزید نشانیاں بھی بتائی ہیں۔

خدا مامح رشی کو سو سونے کے سکے، دس ہار، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دی ہیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اس رشی کو "مامح" بتایا گیا ہے اور ہندوستان میں کوئی بھی اس نام کا رشی نہیں گزرا ہے؛ لہٰذا مامح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت آئی ہے جس کے معنی ہیں عزت دیا گیا، تعریف کیا گیا وغیرہ۔ سو طلائی دینار سے مراد وہ اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے ایمان لائے۔ اسی طرح دس ہار سے مراد وہ عشرہ مبشرہ ہیں جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔

دس ہزار گائیں کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ویدوں میں گائے اور بیل درحقیقت فتح کی

[1] منودھرم شاستر ادھیائے 1۔ اشلوک 102

علامت سمجھی جاتی ہے[1] ویدوں میں اسے فتح کے لیے مضبوط مددگار قرار دیا گیا ہے۔ شت پتھ برہمن[2] میں بھی گائے کو رعب کا مظہر بتایا گیا ہے، شت پتھ برہمن میں ہی ایک اور جگہ[3] گائے کو انسان کی مثل اور ناقابل شکست بتایا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں گؤ سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ فتح مکہ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جماعت تھی۔

مذکورہ منتر تیسری نشانی تین سو گھوڑے عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ گھوڑوں کے لیے یہاں عروہ لفظ آیا ہے جو کہ تیز رفتار عربی گھوڑوں کے لیے سنسکرت میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اس کے ایک معنی تیز رو اور طاقتور بھی ہیں۔ اس بناء پر یہاں تین سو گھوڑے یا تین سو طاقتور لوگ دراصل وہ تین سو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو غزوہ بدر میں آپ کے ساتھ تھے۔

چوتھے منتر میں اس رشی کو ریبھ کا نام دیا گیا، اور حمد الٰہی میں اس کے مقام کا اظہار کیا گیا۔

تبلیغ کر اے ریبھ! جیسے پختہ پھل والے درخت پر پرندہ چہچہاتا ہے، تیری زبان اور ہونٹ قینچیوں کے دو پھلوں کی طرح چلتی ہے۔

ریبھ لفظ کے معنی "تعریف کرنے والا" ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ احمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد

---

[1] رگ وید 10/33/6

[2] کانڈ 5۔ پرپاٹھک 2۔ برہمن 4۔ کنڈکا 13

[3] کانڈ 12۔ پرپاٹھک 9۔ برہمن۔ کنڈکا 7

تقریباً سبھی منتروں میں ریبھ کو حمد کرنے والا، خدا کی بڑائی کرنے والا، دین حق کی پیروی کرنے والا بتایا گیا ہے؛ لہٰذا اسے نقل کرنا طوالت کا باعث ہو گا۔ البتہ گیارہوں منتر اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے دوسری وحی کا ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی وحی کے بعد تبلیغ کرنے کا حکم ان الفاظوں میں ملا۔

اے چادر اوڑھنے والے! اٹھ اور اور خبر دار کر۔ اور اپنے رب کی بڑائی کر۔ (سورۃ المدثر: آیت 1-3)

اس سوکت کے منتر نمبر 11 میں ہے۔

اندر (خدا) نے اپنی حمد کرنے والے کو جگایا، اٹھ! ادھر ادھر لوگوں کے پاس جا، مجھ غالب کی ہی بڑائی کر۔ سب نیک لوگ تیری محنت کی داد دیں گے۔

اس کے بعد کے منتروں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت، اور حمد کا ذکر ہے؛ لہٰذا ہم اسے یہاں نقل نہیں کر رہے۔

اتھروید میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں بلکہ غزوہ احزاب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اتھروید میں ہے:

اے حق پرستوں کے خدا! یہ لوگ جو جامِ معرفت سے مست ہیں، بہادری کے کارنامے انجام دیتے ہیں، اور تجھے خوش کرنے کو نغمہ سرا ہیں اور میدان جنگ میں بغیر خون بہائے انھوں نے شکست دے دی کاروکے دس ہزار دشمنوں کو۔ (اتھروید: کانڈ 20۔ سوکت 21۔ منتر 9)

-

غزوۂ احزاب تاریخِ اسلام میں غزوۂ خندق کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس جنگ میں کفار کی تعداد دس ہزار جب کہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ لیکن باقاعدہ کسی لڑائی کے بغیر ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اس جنگ میں فتح حاصل ہو گئی تھی۔ جیسا کہ اس منتر میں بھی مذکور ہے۔

منتر کے آخر میں لفظ کارواستعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں تعریف کرنے والا۔ عربی میں اس کا ترجمہ احمد ہو گا جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ایک نام ہے۔

اے اندر! بیس بادشاہوں کو معزول کیا اور ان کے تیغ لیس لوگوں کو بھی جو لڑنے آئے تھے اس تعریف وثنا کرنے والے (یعنی احمد) سے۔ (اتھرید، کانڈ 20۔ سوکت 21۔ منتر 7)

یہاں معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ فتح مکہ کے وقت وہاں کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار ہی تھی اور سردارانِ قبائل کی تعداد 20 تھی جنھیں بعد ازاں معزول کر دیا گیا۔

سام وید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک

بقیہ ویدوں کی طرح یہ وید بھی بشارت محمدی سے خالی نہیں ہے، یہاں ہم سام وید کا ایک انتہائی اہم منتر نقل کر رہے ہیں۔

احمد نے اپنے خدا سے قانونِ دائمی کا علم حاصل کیا۔ (سام وید، پرپاٹھک 2 کھنڈ 6 منتر 8)

اس منتر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام واضح طور پر احمد لکھا ہوا ہے۔ اس منتر کے اکثر

مترجمین نے احمد کو سنسکرت مرکب "اہم ات" سمجھا ہے؛ لہٰذا انھوں نے ترجمہ بھی اہم ات کے اعتبار سے اس منتر کا ترجمہ "میں نے ہی اپنے باپ کی سچی حکمت حاصل کی" کیا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ خود ویدوں کے خلاف ہے کیونکہ اس منتر کے رشی وتسہ ہے جس کا تعلق کنو خاندان سے ہے، اور اس طرح کا ذکر ہمیں تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ صرف وتسہ نے ہی اپنے والد سے شریعت حاصل کی۔

اپنشد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں ویدوں کے بعد اپنشد کا درجہ آتا ہے۔ اپنشدوں میں سے ایک اہم اپنشد "اللہ اپنشد" ہے، اس اپنشد کو اکثر "اولّو اپنشد" (Allo Upanishad) بھی کہتے ہیں۔ اس اپنشد کا تعلق اتھرو وید سے ہے۔ یہ مقدس کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خدائے واحد اللہ رب العزت کے متعلق کئی الہامی تعلیمات درج ہیں۔ بھوشیہ پران کی طرح اس کتاب میں بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نام کے ساتھ آیا ہے۔

'اس دیوتا کا نام اللہ ہے، وہ ایک ہے مترا، ورونا وغیرہ اس کی صفات ہیں۔ یقیناً اللہ ورون ہے جو تمام کائنات کا بادشاہ ہے۔ دوستو! اس اللہ کو اپنا معبود سمجھو وہ ورون ہے اور ایک دوست کی طرح وہ تمام لوگوں کے کام سنوارتا ہے۔ وہ اندرا ہے عظیم الشان اندرا۔ اللہ سب سے بڑا سب سے بہتر سب سے زیادہ مکمل اور سب سے زیادہ مقدس ہے۔ محمد رسول اللہ کا عظیم ترین رسول ہے۔ اللہ اول و آخر اور رب العالمین۔ تمام اچھے کام اللہ کے لیے ہی ہیں۔ درحقیقت اللہ ہی نے

-

یہ سورج، چاند اور ستارے پیدا کئے ہیں۔ اللہ نے سب رشی بھیجے اور سورج، چاند، ستاروں کو پیدا کیا۔ اسی نے تمام رشی بھیجے اور آسمانوں کو پیدا کیا۔ اللہ نے ارض و مکان کو ظاہر کیا۔ اللہ عظیم ہے اکے سوا کوئی معبود نہیں۔ اے پجاری!(اتھروا رشی) کہہ دے لا الہٰ الا اللہ۔ اللہ ازل سے ہے۔ وہ رب العالمین ہے، وہ تمام برائیوں اور مصیبتوں کو دور کرنے والا ہے۔ محمد اللہ کے رسول ہیں جو اس عالم کا رب ہے پس اعلان کرو اللہ ایک اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

ہندومت کی اس مقدس کتاب میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی کلمے کا واضح طور پر ذکر دیکھ کر بہت سے ہندوؤں نے اس اپنشد کا انکار کر دیا ہے۔ ان کے مطابق یہ اکبر کے دور کسی مسلمان نے لکھ کر اپنشد بنائی ہے تا کہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کر سکے۔

مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ کسی مسلمان کا کام ہے تو پھر کیوں ہندو پنڈت اسے اپنشد کے نام سے اتنے عرصے تک شائع کیا اور اسے اتھروید کے تتمہ کی حیثیت سے قبول کیا؟ بعض ہندو علما اسے اتھروید میں الحاق مانتے ہیں لیکن اس خود اتھروید بلکہ سارے ویدوں کی Authenticity مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ جب ایک مسلمان کی تحریر کردہ اپنشد میں جگہ پا سکتی ہے تو پھر ہندو پنڈتوں کے اس میں من مانے اضافے کرنا کیا محال ہے؟

اتھروید کے بے شمار نسخوں میں میں یہ اللہ اپنشد کا سوکت موجود ہے، اگر یہ الحاق ہے تو ہمیں انتہائی عجیب بات ماننی پڑے گی کہ ایک مسلم نے یہ تحریر لکھ کر ہر ایک پنڈت کے گھر جا کر اس کے وید نسخے میں اپنی اپنشد شامل کر لی۔ سنسکرت کی ایک قدیم لغت "واچس پتیا" جس کا تعلق

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے کا ہے، اس میں اس اپنشد کا ذکر ہے، راجہ رادھا کانت کی لغت "شبد کلپدرم" میں بھی اس اپنشد کا ذکر ملتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی ان لغات میں اس اپنشد کا حوالہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اپنشد قدیم ہے۔

پرانوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک

پرانوں میں اہم کتاب "بَھوِش پُران" یعنی "مستقبل کی تاریخ" مانی جاتی ہے۔ اپنے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس پران میں مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس پران میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام واضح طور پر سنسکرت متن میں ملتا ہے۔

ایک ملیچھ اجنبی زبان بولنے والا روحانی استاد آئے گا۔ اس کے ساتھ اس کے اصحاب بھی ہوں گے۔ اس کا نام محامد ہو گا۔ راجا بھوج اس مہادیو، مروستھل کے رہنے والے کو گنگا جل سے پاک کرا کے (یعنی گناہوں سے پاک ٹھہرا کے) اسے تحائف پیش کرے گا اور کہے گا کہ میں تیرا وفا دار ہوں۔ اے فخرِ نسل انسانی! اے مروستھل کے رہنے والے! تیرے پاس شے طان کو مارنے کے لیے بہت سی طاقت ہے۔ تجھے تیرے ملیچھ مخالفوں سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ (بھوشیہ پُران، پرتی سرگ، پارو3۔ کھنڈ3۔ ادھیاء3۔ اشلوک8-5)

"ملیچھوں نے مروستھل کی مشہور سرزمین کو ناپاک کر دیا ہے۔ وہاں آریا دھرم نہیں رہا۔ اس سے پہلے بھی وہاں ایک گمراہ شخص ظاہر ہوا تھا جسے میں (خدا) نے ہلاک کر دیا تھا۔ اب ایسا دوبارہ ہوا ہے۔ ایک دشمن نے اسے بھیجا۔ ان دشمنوں کو راہِ ہدایت دکھانے اور ان کی رہنمائی

کے لیے محمد کو بھے جا گیا ہے۔ جسے میں نے برہما کا لقب عطا کیا ہے۔ وہ پشاچاؤ کو صحیح رستے پر لا رہا ہے۔ وہ میرا پیرو ایسا شخص ہو گا جو ختنہ کروائے گا، چوٹی نہیں رکھے گا۔ داڑھی رکھے گا، وہ ایک عظیم انقلاب لانے والا شخص ہو گا۔ وہ عبادت کے لیے صدا دے گا۔ وہ تمام حلال چیزیں کھائے گا، وہ خنزیر کے علاوہ تمام جانوروں کا گوشت کھائے گا۔ وہ مقدس نباتات کے ذریعے پاکی تلاش نہیں کریں گے بلکہ انھیں پاکی جنگ و جدل کے ذریعے ملے گی، وہ لادین قوموں سے جنگ کریں گے اور اسی وجہ سے وہ آستک کہلائیں گے۔ وہ گوشت خور قوم کے دین کی ابتدا کرنے والا ہو گا۔ (بھوش پُران، پرتی سرگ، پارو3۔ کھنڈ3۔ ادھیاء3۔ اشلوک27-10)

بھوشیہ پران کی ان اشلوک میں ملیچھ کا الفاظ آیا ہے۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں غیر آریا اور ناپاک۔ دراصل اس کے معنی غیر آریا ہی تھے لیکن چونکہ آریا قوم اپنے علاوہ دوسری قوموں کو ناپاک سمجھتی تھی؛ اس لیے انھوں نے اس کے ایک معنی ناپاک بھی رکھے۔ اس کے علاوہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی تصدیق ہمیں اس بات سے بھی ملتی ہے کہ اس پیغمبر کی جائے پیدائش میں آریا دھرم موجود نہیں رہا ہو گا۔ یعنی وہ پیغمبر آریا مذہب کے حقیقی عقیدے یعنی توحید کی دعوت دے گا اور گمراہ لوگوں کی اصلاح کرے گا۔ اور خود وہ پیغمبر ملیچھ یعنی غیر آریائی ہو گا۔

کلکی اوتار اور حضرت محمد ﷺ

بھارت کے ایک فاضل ہندو پنڈت نے "کلکی اوتار اور حضرت محمد ﷺ" کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی جس میں یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندو اپنے عقیدے کے مطابق جس آخری اوتار

کلکی کی آمد کے منتظر ہیں وہ حضرت محمد ﷺ ہی ہیں۔ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ ہندوؤں کو اب اس موعودہ اوتار کے انتظار کو چھوڑ کر حضرت محمد ﷺ کو آخری اوتار تسلیم کر لینا چاہیے۔ کیونکہ کلکی کی علامات اور حضرت محمد ﷺ کی شخصیت میں بہت سی مماثلت ہے۔ یہاں ہم اس کتاب میں بیان کردہ دلائل اور تفصیل کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔

کلکی کی پیدائش کے بارے میں پران میں لکھا ہے۔

کلکی شمبھل میں ایک سردار کے گھر پیدا ہو گا، جہاں وشنو بستا ہے۔

وہ کلکی وشنویش کے خاندان میں شمبھل کے ممتاز گھرانے میں پیدا ہو گا۔ وہ آٹھ اعلیٰ قوتیں بخشا ہوا ہو گا۔ اپنی ناقابل شکست طاقت سے وہ دنیا سے تمام ملیچھوں اور چوروں کا خاتمہ کر دے گا۔

وہ دھرتی پہ دوبارہ دھرم کو قائم کرے گا۔ (وشنو پران۔ کتاب 4۔ باب 24)[1]

یہی بات کلکی کے متعلق مہا بھگوتم پران[2] میں بھی بتائی گئی ہے۔ جس اشلوک میں انتم اوتار کا مقام پیدائش بتایا گیا ہے۔

سنسکرت لفظ مروستھل سے مراد ریتیلا علاقہ یا صحرا ہوتا ہے جیسا کہ عرب۔ وشنو کا وہاں بسنے سے مراد خدا کا گھر ہونا ہے، اور دوسرے لفظ شمبھل کے معنی دار الامن یعنی "امن والی جگہ" کے

[1] **Vishnupuranam,** (Based on Professor H. H. Wilson's translation, Manmatha Nath Dutt,) Kolkata: Elysium Press, 1896

[2] بھگوت پران، سکند 12 ادھیائے 2، اشلوک 18

ہیں۔ چونکہ مکہ مکرمہ میں کعبہ واقع ہے جو کہ روئے زمین پر خدا کی عبادت کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے؛ لہٰذا یہاں کی ہر شے کو امن و امان حاصل ہے 'حتیٰ کہ پودوں اور درختوں کو بھی نہیں کاٹا جاسکتا۔ اس مقام کا یہ تقدس زمانہ جاہلیت میں بھی یونہی قائم تھا۔ اگر کوئی شخص کوئی جرم کر کے حرم چلا جاتا تو اسے کچھ نہ کہا جاتا بلکہ اس کے حرم سے نکلنے کا انتظار کیا جاتا۔ امن و سلامتی کی اسی بناء پر مکہ معظمہ کو عربی زبان میں دارالامن بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں سلامتی کا گھر۔ قرآن مجید میں بھی اس حرم پاک کو دار الامان قرار دیا گیا ہے:

جو شخص اس (حرم) میں داخل ہو جائے امن والا ہے۔ (سورۃ ال عمران: آیت 97)

جائے پیدائش کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ پران ہمیں ان کے والدین اور ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کیا بتاتا ہے۔ کلکی کے والدین اور اس کی تاریخ ولادت کے بارے میں پران میں لکھا ہے:

آخر کار وشنویش کی بیوی سومتی حاملہ ہو گی تو کلکی زمین کی طرف بھیجا جائے گا، وائیسا کھ مہینے میں بارہ تاریخ کو جب چاند پورا اور روشن ہو گا۔ (کلکی پُران ادھیاء 2۔ اشلوک 11۔15)

وہ کلکی وشنویش کے خاندان میں شمبھل کے ممتاز گھرانے میں پیدا ہو گا۔ (وشنو پران۔ کتاب 4۔ باب 24)

کلکی پران میں والد کا نام وشنویش بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں خدا کا بندہ۔ پران میں کہیں ان کا نام وشنو بھگت بھی ہے۔ وشنو سنسکرت میں خدا کا نام ہے اور یش یا بھگت سے مراد بندہ اور غلام

ہے۔ گویا وشنویش کا عربی ترجمہ عبداللہ ہے۔ اس کے علاوہ پنڈت وید پرکاش اپادھیائے کے مطابق کلکی کی والدہ کا نام "سومانی" (یاسومتی) کا عربی ترجمہ آمنہ ہوتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا نام "آمنہ" اور والد کا نام "عبداللہ" تھا۔ کلکی کا جنم ایک معزز برہمن یعنی کسی سردار کے گھر ہوگا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ولادت باسعادت مکہ مکرمہ میں صدر متولی کعبہ عبداللہ کے گھر ہوئی۔

کلکی کی تاریخ پیدائش ہندی ماہ بائیسا کھا کی بارہویں تاریخ بتائی گئی ہے۔ ہندی مہینہ وائیسا کھا عیسوی کیلنڈر کے مطابق اپریل سے مئی تک رہتا ہے۔ اور اسلامی حساب سے ربیع الاوّل۔ وائیسا کھا کی بارہویں تاریخ 15 سے 26 اپریل تک آتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت بھی اسلامی ماہ ربیع الاول کی 9 ہوئی جب اپریل کی 20 یا 22 تاریخ تھی اور ہندی کیلنڈر کے مطابق بائیسا کھا کی بارہویں تاریخ تھی۔

ایک اہم شہادت ہمیں ان کے دور کے متعلق یہ بھی ملتی ہے کہ پران کے مطابق کلکی گھڑ سوار ہوگا اور تلوار سے بدکاروں کا خاتمہ کرے گا۔

کلکی ملائکہ کے ذریعے دیے گئے گھوڑے پر سوار ہوکر تلوار سے بدکاروں کا خاتمہ کرے گا۔

(بھگوت پران، سکند 12 ادھیائے 2، اشلوک 19)

موجودہ دور جنگ میں تلوار یا گھوڑے کے استعمال کا نہیں ہے۔ یہ دور تقریباً 300 سال قبل تک

ہی رہا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جنگ میں تلوار اور گھوڑے استعمال ہوتے تھے۔ تلوار کا استعمال اور گھوڑے کی سواری، دونوں ہی حضرت محمد نے کئی بار کی۔ مقام پیدائش ،والدین، حتیٰ کہ تاریخ ولادت کا ذکر ہو اور شریک حیات کا ذکر نہ کیا جائے یہ ممکن نہیں، پران میں کلکی کی پہلی زوجہ کے بارے میں ہے:

وہ کنول کے پھول (کی مثل) خاتون سے شادی کرے گا۔ (کلکی پران ادھیاء3۔ اشلوک9)

اس اشلوک میں لفظ پادما آیا ہے جس کے معنی کنول کے پھول ہیں، اب یہ بات ظاہر ہے کہ کلکی انسان ہوں گے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کلکی ایک پھول سے شادی کرے؟ یہ لفظ ان کی زوجہ کا صفاتی نام بتایا گیا ہے یعنی کلکی اوتار کی شادی ایک ایسی خاتون سے ہو گی جو کنول کے پھول کی مانند ہو گی۔ کنول کا پھول کے چڑ میں کھلتا ہے۔ چنانچہ کنول کے پھول کی مثل سے مراد یہ ہے کہ وہ خاتون ایک برے اور اخلاقی برائیوں کی گندگی میں گھرے معاشرے میں بھی اعلیٰ کردار کی حامل ہو گی۔ اب ذرا تاریخ عرب دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ آپ کے وقت عرب نہایت اخلاقی گراوٹ کا شکار تھا۔ ایسے معاشرے میں محمد ﷺ کا نکاح جن سے ہوا وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں جو ان حالات کے باوجود نہایت باعفت اور پاکباز خاتون تھیں۔ یعنی کنول کے پھول کی مثل۔

بھگوت پران[1] میں اس اوتار کو جگت پتی کہا گیا ہے۔ لفظ جگت کے معنی "عالم / جہان" کے ہیں۔ اور پتی کے معنی "حفاظت کرنے والا"۔ چنانچہ اس مرکب کے معنی یہ ہوئے کہ آخری اوتار برائیوں سے سارے جہان کی حفاظت کرنے والا ہو گا۔ قرآن مجید میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کا نبی کہا گیا ہے۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اعلان کر دو کہ تم ساری دنیا کے لیے نبی ہو کر آئے ہو۔ (سورۃ الاعراف: آیت 158)

بھگوت پران میں چوبیس اوتاروں کے سلسلے میں کلکی کو آخری پیغمبر بتایا گیا ہے۔ اسلام کے علاوہ کسی مذہب کے پیغمبر کے متعلق ہمیں یہ دعویٰ نہیں ملتا کہ وہ آخری پیغمبر ہیں۔ جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ میں خاتم النبیین ہوں یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور قرآن مجید میں بھی انھیں تمام پیغمبروں پر مہر (خاتم) کہا گیا ہے۔ اور اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو مختلف مقامات پر 25 پیغمبروں کے نام درج ہیں، جن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔

کلکی پران میں مذکور ہے کہ کلکی اپنے چار اصحاب کے ساتھ شیطان کا انسداد کرے گا۔

کلکی اپنے چار اصحاب کے ساتھ شیطان کا انسداد کرے گا۔ (کلکی پران۔ ادھیاء 2۔ اشلوک 5)

[1] سکنڈ 12۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 19

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے چار خاص اصحاب کے ساتھ شیطان کا انسداد فرمایا۔ اور یہ چار اصحاب ان کے بہترین ساتھی تھے جنہوں نے پیغامِ توحید کی تبلیغ فرمائی۔ حضرت محمد کے انتقال کے بعد یہی چار خلفاء تھے جو ان کے جانشین ہوئے۔ ان خلفاء کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۲۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۴۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

بھگوت پران[1] اور میں وشنو پران میں کلکی کو اَشت ایشوریہ گڑانوت یعنی آٹھ صفاتَ جاہ و چشم والا کہا گیا ہے۔ یہ صفات حسب ذیل ہیں۔

علم و دانائی ۔2۔اعلیٰ نسبی۔3۔علم الکتاب۔4۔شجاعت۔5۔ضبط نفس ۔6۔کم گوئی۔7۔سخاوت۔8۔شکر گزاری

یہ آٹھوں صفات آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ علم و دانائی، اعلیٰ نسبی، ضبط نفس، علم الکتاب، شجاعت، خاموش طبعی، جود و سخا اور شکر گزاری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی بھی نہ تھا۔ یہاں ہر ایک صفات کو سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کرنا باعث طوالت ہو گا اس کے لیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

[1] سکند 12۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 19

سب سے آخر میں ہم اس حوالے سے بھگوت پران کی ایک اشلوک نقل کررہے ہیں۔ اس اشلوک کا سنسکرت متن (تلفظ) اس طرح سے ہے۔

اگیان بیتو کرِت موح مد اندھکار ناشم ودھایم بی تدو دیتے ویو یکہہ

جب بے شمار ادوار حیات میں اجتماعی خیر کے طلوع ہونے سے انسان کو حق کا فیضان حاصل ہونے والا ہو۔ تب لالچ اور شراب جیسی تاریکیوں کا خاتمہ ہو کر فہم وحکمت کا نور طلوع ہو گا۔ (بھگوت پران۔2/27)

اس اشلوک کے سنسکرت متن میں لفظ "موح مد" واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ سنسکرت میں یہ لفظ ایک ہی لکیر کے تحت ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موح اور مد اور دو الگ الفاظ نہیں بلکہ ایک ہی یعنی محمد ہے۔ لیکن موجودہ دور میں اس کا ترجمہ موح (لالچ) اور مد (شراب) الگ کرکے کیا جارہا ہے۔ اگر ہم اس اشلوک کا ترجمہ سنسکرت متن کے مطابق ہی لفظ کے ٹکڑے کیے بغیر کریں تو ترجمہ یوں ہو گا۔

جب بے شمار ادوار حیات میں اجتماعی خیر کے طلوع ہونے سے انسان کو فیضانِ حق حاصل ہونے والا ہو تب محمد کے ذریعے تاریکیوں کا خاتمہ ہو کر فہم وحکمت کا نور طلوع ہو گا۔

پیش گوئیوں کے بارے میں پنڈت حضرات کا موقف

کلکی کی وہ صفات جو ہنود کے مطابق آپ پر صادق نہیں آتی

ان پیش گوئیوں کے بارے میں ہندو پنڈت حضرات کا یہ موقف ہے کہ یہ پیشن گوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق نہیں آتی کیونکہ کلکی کے بارے مزید جو علامات مقدس کتابوں میں بتائی گئیں ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق نہیں آتیں۔ ان میں سے چند ایسی علامات کلکی پران میں کلکی کی پیدائش سے متعلق منقول ہیں' یہ ہیں:

- کلکی کی پیدائش سے پہلے ان کی ماں سومتی کے ہاں تین بیٹے ہوں گے۔[1]
- کلکی کو پیدائش کے وقت گنگا کے پانی سے نہلایا جائے گا۔[2]
- کلکی کی پیدائش پر سومتی برہمنوں کو 100 گائیں کا تحفہ دے گی۔[3]
- انھیں برہمن رگ، یجر اور سام وید کے منتر سنائیں گے۔[4]
- کلکی اپنے والد سے گفتگو کریں گے۔[5] جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی انتقال

[1] کلکی پران۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 31
[2] کلکی پران۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 16
[3] کلکی پران۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 24
[4] کلکی پران۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 25
[5] کلکی پران۔ ادھیائے 2۔ اشلوک 36

کر گئے۔

اسی طرح کلکی پران میں اور بھی جو تفصیل بیان ہوئی ہے ان کا اطلاق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ اتھر وید کے جس منتر میں آپ ﷺ کی دو اونٹنیوں کا ذکر ہے وہاں اتھر وید کے بعض نسخوں میں "دوِردش" استعمال ہوا ہے جس کے معنی بیس اونٹ ہوتے۔ چنانچہ سیرت النبی سے مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ کس سفر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازدواج کے ہمراہ بیس اونٹنیوں پر سفر کیا۔

ان اعتراضات کے جواب میں مسلمانوں کا یہ موقف رہا ہے کہ کلکی پران خود ہنود کے ہاں اُپا پران (یعنی ثانوی حیثیت کی پران) ہے، اور چونکہ یہ کتابیں لفظی اعتبار سے تحریف شدہ ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ساری علامات اسی طرح اب تک موجود ہوں۔ بالفرض اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ کلکی اوتار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں، کوئی اور شخصیت ہیں تو بھی اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کیونکہ ویدوں میں بیان کردہ میں سبھی نشانیاں بالکل واضح ہیں اور آپ کے علاوہ کسی پر صادق نہیں آتی۔

اتھر وید کے اعتراض کے جواب میں مسلمان کہتے ہیں کہ خود ہنود کا ماننا ہے کہ یہ سبھی شاخیں صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں لہٰذا اگر ہم اس لفظ کی تشریح دوسری شاخ کے مطابق کرتے ہیں تو اسے تسلیم کرنے میں کوئی مانع نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں بیویوں کا ذکر ہے۔ بصورتِ

دیگر یہ بات لازم آتی ہے کہ ویدوں میں تحریف ہوئی ہے۔ نیز ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ ہندومت کی پوری تاریخ میں ''مامح'' نام کا کوئی رشی نہیں گزرا ہے جس کے لیے یہ منتر کہے گئے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ہنود وہ ایسا رشی اور اس کی تاریخ پیش کرنی چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ ''مامح'' رشی کا اطلاق حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی اور پر کرنا ممکن نہیں۔

باب8:سناتن دھرم اور دین قیّم

گزشتہ ماڈیول میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ہندومت کا اصل نام سناتن دھرم ہے۔ہنود اپنے دین کو "سناتن دھرم" ہی کہتے ہیں جس کے معنی ہیں سدا سے سیدھا چلا ہوا دھرم۔دھرم کی معنی قانون اور ضابطہ حیات کے ہیں۔عام الفاظ میں اس کے معنی ہوئے "وہ دین جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔"

اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرامؑ نے دین اسلام کی ہی دعوت دی یعنی اسلام وہ دین ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ البینہ آیت 5 میں ایک اصطلاح "دین قیمۃ" استعمال ہوئی ہے دین کے معنی جزا، قانون اور ضابطہ حیات کے ہیں۔یعنی اپنے معنوں میں یہ لفظ "دھرم" کے ہم معنی ہے۔اسی طرح "قیم" کے معنی بھی مستحکم، مضبوط اور سیدھا چلا ہوا ہے۔چنانچہ سناتن دھرم کا عربی ترجمہ "دین قیمہ" ہو گا۔

اگر قرآن کا پیش کردہ تصور کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیا کے سبھی مذاہب سناتن دھرم ہی تھے لیکن ان قوموں نے اپنے اپنے مذاہب کے مختلف نام عیسائیت،

یہودیت، بدھ مت وغیرہ رکھ لیے۔ مگر دنیا کی اس قدیم ترین قوم نے اپنے ابدی دین "اسلام" کا صفاتی نام ابھی بھی یاد رکھا ہوا ہے۔ واضح رہے کہ جنوبی ہند میں جنم لینے والی ایک وشنو بھکتی تحریک کو "سرن گتی" اور "پرپتّی" کہا جاتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کے معنی Surrender ہے جس کا عربی ترجمہ اسلام ہے۔

توحید

اگرچہ ہندو دھرم کی کتب مقدسہ آج ہمارے سامنے اس صورت میں نہیں ہے جیسا کہ اس کے رشیوں کو تعلیم ہوئی تھی، اور آج تک ان کتابوں میں کئی لفظی و معنوی تبدلیاں کی گئی ہیں لیکن خدا کی ہستی کے متعلق ہمیں ان کتب میں چند مقامات پر توحید کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ ان میں سے کچھ مثالیں حسب ذیل ہیں۔

> اور ایسے لوگ جو پورے انہاک سے میری عبادت کرتے ہیں اور میری ماورائی صورت پر دھیان لگاتے ہیں میں ان کی تمام ضروریات کا بوجھ اٹھاتا ہوں اور جو ان کے پاس ہے اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ (بھگود گیتا۔ ادھیائے 4۔ اشلوک 8-7)[1]

> اس خدا کی معرفت رکھنے والے لوگوں کے لیے وہ ایک اور تنہا ہے۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں، نواں یا دسواں ایشور نہیں ہے۔ (اتھروید: کانڈ 13۔ سوکت 4۔

[1] ہنود کے مطابق یہ اشلوک شری کرشن کی (بطور ایشور) عبادت کے لیے ہے۔

-

منتر 15-18)[1]

ہم نے تیری تعریف کی، اے سب سے اعلیٰ اور روشن ہستی! تم انسانوں کے لاشریک مالک ہو۔ تم ہی کائنات کے واحد مختار ہو۔ (رگ وید منڈل:6۔ سوکت 36۔ منتر 4)[2]

میں فانی و غیر فانی دونوں سے برتر ہوں۔ مجھے وید اور ساری کائنات میں پرش کہہ کر پکارا جاتا ہے ۔ جو شخص مجھے روحِ اعلیٰ پرش کے طور پر جانتا ہے وہ صرف میری ہی پرستش کرتا ہے۔ (بھگود گیتا۔ ادھیائے ۱۵۔ اشلوک۔ 19-18)

ہندو مذہب میں تبدیلی کیونکر ہوئی؟

یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بناء پر ہنود شرک کی گھاٹیوں میں پہنچے؟ ان کے سناتن دھرم کی اصلی صورت کیسے مسخ ہوئی اور کس طرح یہ لوگ غیر اخلاقی افعال اور ناعقلی میں مبتلا ہوئے؟

تاریخ اس کا جواب نہایت مبہم انداز میں ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ہندو دھرم میں ان روایات کی غلط ترجمانی کی پہلی وجہ مقدس کتابوں کی تحریری شکل میں غیر موجودگی ہے۔ وید ہزاروں برس تک برہمنوں کے سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہی۔ اس طرح وید میں پیغمبروں کا کلام بھی شامل ہو گیا

[1] یہ منتر سوریہ دیوتا کی مدح میں کہا گیا ہے۔

[2] ۔۔ اندر دیوتا

اور زمانے کے شاعروں کا بھی۔ عوام کو یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ کون سا کلام وید کا ہے اور کون سا عام انسانوں کا؛ لہٰذا اگر کوئی اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات یا اپنے مشاہدات کو بھی منظوم کرتا تو وہ بھی مشہور ہو کر وید میں شامل ہو جاتے۔ حتیٰ کہ لوگ کسی حالت غیر میں بھی کچھ کہہ اٹھتے تو اسے وید مان لیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وید میں ہزاروں سال سے تلفظ، مفہوم اور الفاظوں میں تبدیلی ہوتی گئی؛ اور ہندو قوم اپنے پیغمبروں کی حقیقی اور منزّہ تعلیم سے محروم ہو گئی۔

دوسری وجہ مقدس کتابوں پر برہمنوں کی اجارہ داری ہے۔ برہمنوں نے اصلی "سناتن دھرم" کو عوام الناس سے چھپانے اور انھیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے نچلی ذاتوں کے لیے مقدس کتابوں کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا اور صحائف کے بعض حصوں کا سننا تو عام برہمن کے لیے بھی منع کر دیا گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ عوام کی حق سے دوری اور شرک کے مرض میں مبتلاء ہونا تھا۔ نیز انھوں نے ویدوں کی من مانی شروح بھی لکھیں، الفاظوں کو من مانے معنی دیے اور ویدوں کے وہ منتر جو توحید الٰہی ثابت کرتے تھے، ان کا سیاق و سباق بدل کر انھیں شرک سے زنگ آلودہ کر دیا۔ وید یا دیگر اہم کتابوں میں جو الفاظ اپنے مفہوم کو بیان کرنے کے لیے تھے، کج فہم مذہبی طبقے نے ان کے ظاہری معنی لیے اور اسی کو عقیدے کی حیثیت سے پیش کیا۔ مثلاً گیتا میں جہاں برہما کو وشوتومکھ [1] بتایا گیا تو اس کی مورتی چار چہرے والی بنا دی گئی۔ حالانکہ اس کا مفہوم وہی

[1] 10:33

-

تھا جو قرآن میں وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ کے الفاظ سے بتایا گیا ہے کہ اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔ تو جدھر تم رخ کرو۔ ادھر اللہ کی ذات ہے۔ بے شک اللہ صاحبِ وسعت اور باخبر ہے۔[1] آخری اور اہم ترین وجہ زبان کا غلط ترجمہ اور ترجمانی ہے۔ وید کا بیشتر حصہ تمثیلی زبان میں بیان کیا گیا ہے؛ اس لیے اس کا صحیح ترجمہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔

ان سب وجوہات کو دیکھیں تو یہ سارا منظر عقل کے سامنے آجاتا ہے کہ کس طرح اصنام شکن پیغمبروں کی اولاد (اور امّت) اصنام پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ کس طرح آسمانی ہدایت تحریف، توہم پرستی اور جہالت کی نذر ہو گئی۔

ہندو متون مقدسہ کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس تہذیب میں رونماء ہونے والے تاریخی واقعات و حقائق اور دیومالائی قصوں اور تمثیلی زبان میں بیان کردہ باتوں کو سمجھ سکیں۔

[1] سورۃ البقرۃ۔ آیت 115

-

حصہ سوم:

ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں کو اسلام کی دعوت

باب10: ہندو مسلم اتحاد: درپیش مسائل اور ان کا حل

بابری مسجد

[1]بھارتی ریاست اتر پردیش کے شہر ایودھیاء میں واقع بابری مسجد مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر (1526-1530) نے 1527 میں تعمیر کروائی تھی۔ مستند تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے صدیوں پہلے مسلمان ایودھیا میں آباد تھے اور یہاں کے ہندو مسلم پوری یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ رہتے تھے۔ تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی مذہبی معاملہ میں یہاں کے باشندوں کے درمیان کوئی تنازعہ رونما ہوا یا باہمی ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو۔ لیکن ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قیام کے بعد معاملات مختلف ہو گئے اور دونوں قوموں کے مابین غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔

1855 کے بعد یہ قضیہ مشہور ہوا کہ بابری مسجد شری رام کی جنم بھومی یعنی جائے پیدائش پر تعمیر کی گئی ہے اور یہ جگہ پہلے ایک مندر تھی۔ جب کہ مسلمان اس نظریہ کو مسترد کرتے رہے۔ ضلع

[1] ماخوذ از: مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ **بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں**۔ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ 10-9، جلد: 94 ستمبر-اکتوبر 2010
(http://darululoom-deoband.com/urdu/magazine/new/index.php)

فیض آباد کے گزیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت باہمی اتفاق و یگانگت کو مستحکم کرنے کی غرض سے ایودھیا کے مسلم رہنما امیر علی اور ہندو رہنما بابا چرن داس نے رام جنم استھان اور بابری مسجد کے تنازعہ کو مفاہمت کے ذریعے مستقل طور پر ختم کرنے کی غرض سے ایک معاہدہ کیا کہ رام جنم استھان کی مخصوص متنازعہ اراضی ہندوؤں کے حوالہ کر دی جائے اور ہندو بابری مسجد کی عمارت سے دست کش ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک معقول فیصلہ تھا چنانچہ اس معاہدہ پر فریقین خوشی خوشی راضی ہو گئے اور دو سال سے اختلاف کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ ٹھنڈی ہو گئی، مگر جلد ہی انگریزوں نے بابا رام چرن داس اور امیر علی دونوں کو ایک ساتھ پھانسی دے دی اور دوسری جانب فتنہ پسندوں نے مندر مسجد کے نزاع کو از سر نو زندہ کرنے کی غرض سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکسایا کہ وہ اس تقسیم کو مسترد کر دیں چنانچہ یہ کشاکش پھر شروع ہو گئی جس کی سے برسوں تک فسادات چلتے رہے۔

ہم نے دیکھا کہ رام چرن داس اور امیر علی نے بابری مسجد کے مسئلے کو اس وقت حل کر لیا جب تک یہ محض ایک چھوٹا سا مقامی مسئلہ تھا۔ جب یہ قومی مسئلہ بن گیا تو کوئی اسے حل نہ کر سکا۔ آج بھی یہ تنازع مسلمانوں اور ہندوؤں میں نفرت کا باعث بن رہا ہے۔ دونوں اقوام کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ جذباتیت چھوڑ کر جذبہ ایثار کے ساتھ باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے اس مسئلے کو حل کریں۔

-

گائے ذبح کرنا

مسلمان، عیسائیوں اور بعض نچلی ذات کے ہندوؤں کے نزدیک گائے کا گوشت حلال ہے اس لیے وہ گائے کو ذبح کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ جبکہ ہندوؤں کے مختلف گروہ اگرچہ کسی نہ کسی طور پر گوشت کا استعمال بطور خوراک کرتے آئے ہیں لیکن گائے ان کے ہاں انتہائی تقدس کی حامل ہے لہٰذا ان کے لیے گائے کی قربانی کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ خاص طور پر ہندو اکثریتی خطے میں یہ ایک انتہائی حساس مسئلہ ہے۔

ہندوستان میں بعض ہندو مسلم فساد کی وجہ گائے کو ذبح کرنا بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ معاملہ انتہائی سنگین ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بابر، ہمایوں، اکبر اور کئی مسلم حکمرانوں کے دور میں گائے کے ذبیح پر پابندی رہی۔ ہندوؤں کی گائے سے اپنی جان سے زیادہ عقیدت کے ایسے علاقوں میں پیش نظر مسلمانوں کو ان کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے اور گائے کی بجائے کسی اور جانور کی قربانی کر لینی چاہیے۔ مسلمانوں لیے عید الاضحیٰ کے موقع پر گائے کی ہی قربانی ضروری نہیں اس لیے مسلم علما بھی اس پر پابندی کے جواز کے قائل رہے ہیں۔ بھارت میں واقع ازہرِ ہند کہلانے والی مشہور درس گاہ دار العلوم دیوبند کا فتویٰ بھی اس حوالے سے یہی ہے کہ مسلمان امن و سلامتی اور ہندو برادری کے جذبات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عید الاضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی نہ کریں۔ اگر گائے کی قربانی ہی ضروری ہو تو اسے

کھلے عام نہ کریں۔

میڈیا کا منفی کردار

جدید معاشرے میں افراد کے ذہن پر جو عوامل اثر انداز ہوتے ہیں ان میں میڈیا کو سب سے نمایاں اور موثر مقام حاصل ہے۔ گو کہ اصولی اور قانونی طور پر میڈیا آزاد، غیر جانب دار اور معروضی تجزیے کے اہل ہیں لیکن حالات حاضرہ سے متعلق خبریں دیتے ہوئے بسا اوقات خبر کا ایک رخ دکھایا جاتا ہے۔ بالخصوص ایسے معاملات جس میں کسی نہ کسی سطح پر مذہبی عنصر شامل ہو تصویر کا ایک رخ پیش کرنا، یا اسے مخصوص زاویہ نگاہ سے ہی دکھانا اب میڈیا میں عام سی بات ہے۔ جب کبھی غیر قانونی عبادت گاہوں کے انہدام کا معاملہ اٹھتا ہے تو اسے مذہبی رنگ دیا جاتا ہے۔ ان معاملات میں معاصر ذرائع ابلاغ کے مبالغہ آمیز اور غیر محتاط بیانات کی وجہ سے جو غلط تاثرات عوام میں ابھرتے ہیں اس نے دونوں اقوام کے مابین نفرت وعداوت اور شر انگیزی کو فروغ دیا ہے۔

ہندو مسلم تعلقات اور سیاسی مسائل

تقسیم کے بعد پاکستان اور بھارت کے مابین کئی مسائل سامنے آئے ہیں جن میں کشمیر، کارگل اور دیگر سیاسی نوعیت کے مسائل ہیں۔ مسائل صرف سیاست تک محدود نہیں بلکہ اس کا اثر دونوں

ملکوں کے عوام کے ذہنوں پر بھی پڑا ہے، بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہم اتحاد و محبت اور دعوتِ دین کے فروغ میں یہ سیاسی مسائل بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ایسے حالات میں کہ جب داعی اور مدعو میں باہم نفرت و چپقلش انتہاء کی ہو تو وہاں اسلام کی دعوت کا کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟

ان حالات کے پیش نظر داعین اسلام کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ ہندوؤں کو دعوت دیتے ہوئے اپنے سیاسی مسائل میں پیچھے ہٹ جائیں۔ اس بات کو خود سمجھنا اور سمجھانا بھی چاہیے کہ ریاست کے معاملات دراصل انتظامی امور اور امورِ سیاست پر فائز افراد کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، عوام الناس کی ان سے قومی عقیدت ہونے کے باوجود کوئی عملی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی سیاسی مسئلہ پر اپنی رائے دینا اور اس کے نفاذ کے لیے مناسب جدوجہد کرنا درست ہے لیکن ساتھ اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ سیاسی مسائل میں نفرت کے جس جذبے کو ہم دینی حمیت و غیرت کا تقاضا سمجھ بیٹھے ہیں، قرآن مجید اس کی کہیں تصدیق نہیں کرتا۔

تعصبانہ تاریخ

تاریخ سے متعلق نصاب پر ہم اپنی رائے کے بجائے ہم پروفیسر بشمبھر ناتھ پانڈے کی تقریر کے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے جولائی 1977ء میں پارلیمنٹ میں کی۔ اس وقت یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کا نصاب کیسا ہو جس سے ہندوستانی اقوام میں ہم آہنگی پیدا

کی جاسکے۔ اس تقریر کے کچھ حصے یہ ہیں۔

"بد قسمتی سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں گزشتہ کئی نسلوں سے جو کتابیں پڑھائی جارہی ہیں وہ وہی ہیں جو یورپی مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں اور یورپی اساتذہ نے جو کچھ پڑھایا ہے اس کے اثرات ہم اب تک دور نہیں کر سکے ہیں۔ ایسی لکھی ہوئی تاریخوں سے جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ہماری قومی زندگی کے سرچشمہ کو آلودہ کیے ہوئے ہیں، ان کتابوں میں ایسے اختلافات پر زور دیا گیا ہے کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کر کے لوٹ مار کرتے اور مذہبی تعصب دکھاتے۔ ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایات کو تہس نہس کرنے میں مشغول رہے۔ ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑیں اور ان کے سامنے یہ خوف ناک شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبوک کرو ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی۔ پھر یہ چیزیں زندگی کے اس زمانہ میں پڑھائی جاتی ہیں جب ذہن پر کسی چیز کا گہرا اثر پڑ جاتا ہے تو پھر اس کا دور ہونا مشکل ہوتا ہے، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہوگئے اور ان میں باہمی بد اعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔۔۔

اس کے ساتھ برطانوی حکومت کی دستاویزات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر کس کس طرح عمل کیا۔۔۔[اس]خاص پالیسی کے تحت ہندوستان کی تاریخ سے متعلق نصاب کی کتابیں تیار کی گئیں اور واقعات کو توڑ مروڑ اور جھٹلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر

بڑے مظالم کیے، ان کو اسلامی حکومت میں خوف ناک ذلتیں برداشت کرنی پڑیں اور ان دونوں فرقوں کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں تھیں۔۔۔

جب میں 1928 میں الٰہ آباد میں ٹیپو سلطان پر ریسرچ کر رہا تھا تو وہاں کے کالج کے کچھ طلبا نے میرے پاس اپنی ہسٹری ایسوسی ایشن کے افتتاح کرنے کی دعوت دی، وہ کالج سے سیدھے میرے پاس آئے تھے، ان کے ساتھ ان کے نصاب کی کتابیں بھی تھیں، میں نے ان کی تاریخ کی کتاب میں ٹیپو سلطان سے متعلق باب کھول کر ایک نظر ڈالنی شروع کی تو اس کے بعض جملوں کو پڑھ کر کھٹک پیدا ہوئی، اس میں لکھا ہوا تھا کہ تین ہزار برہمنوں نے محض اس لیے خودکشی کرلی تھی کہ ٹیپو ان کو زبردستی اسلام کے دائرے میں لانا چاہتا تھا۔ اس کتاب کو ترتیب دینے والے مہاپادھیاڈاکٹر ہرپرشاد شاستری صدر شعبہ سنسکرت کلکتہ یونیورسٹی تھے، میں نے فوراً ڈاکٹرشاستری سے اس بیان کی سند کا حوالہ دریافت کیا، ان کو خطوط لکھے تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ میسور گزیٹر سے لیا گیا ہے، یہ گزیٹر مجھ کو نہ الٰہ آباد اور نہ امپریل لائبریری کلکتہ میں ملا، اس وقت میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ہری چندر ناتھ سیل تھے، میں نے ایک خط کے ذریعے ان سے اس واقعہ کی تصدیق چاہی، انھوں نے میرے خط کو پروفیسر سری کانتیا کے پاس بھیج دیا جو اس وقت میسور گزیٹر کا نیا ایڈیشن مرتب کر رہے تھے، انھوں نے مجھے لکھ کر بھیجا کہ میسور گزیٹر میں ایسا کوئی واقعہ درج نہیں ہے، پھر یہ بھی لکھا کہ وہ میسور کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میسور میں ایسا کوئی واقعہ کبھی پیش نہیں آیا، یہ بھی لکھا کہ ٹیپو سلطان کا وزیر اعظم پونیا نامی ایک برہمن تھا اور اس کا فوجی سپہ سالار بھی کرشن راؤ نامی برہمن تھا۔ پھر انھوں نے مجھے میسور کے ایک سو چھپن(156) مندروں کی فہرست بھی

بھیجی جن کو ٹیپو سلطان سالانہ امداد دیا کرتا تھا۔ ٹیپو سلطان کے بڑے خوشگوار تعلقات میسور کے سری نگری مٹھ کے جگد گرو شنکر اچاریہ سے تھے۔ ٹیپو نے ان کو جو خطوط لکھے تھے، ان میں سے تیس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی جواب کے ساتھ منسلک کر دی تھیں۔ میسور کے فرمانرواؤں کا معمول تھا کہ سنگا پٹنم کے اندر جور نگاناتھ مندر ہے وہاں وہ جایا کرتے تھے، ٹیپو سلطان بھی اپنے صبح کے ناشتے سے پہلے وہاں روزانہ جایا کرتا تھا۔ پروفیسر شری کانتیا نے یہ بھی لکھا کہ ڈاکٹر شاستری نے شاید یہ واقعہ کرنل مائلس کی ہسٹری آف میسور سے لیا ہو، جنھوں نے فارسی کے ایک مخطوطہ تاریخ ٹیپو سلطان کا ترجمہ کیا ہے، یہ مخطوطہ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی لائبریری میں ہے، میں نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ایسا کوئی مخطوطہ ملکہ وکٹوریہ کے کتب خانہ میں نہیں ہے۔ کرنل مائلس کی تاریخ میں سارے واقعات من گھڑت اور جھوٹے ہیں۔ ڈاکٹر شاستری کی کتاب بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ، یوپی، ایم پی اور راجستھان کے اسکولوں کے نصاب میں داخل تھی، میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر آشوتوش مکرجی سے خط و کتابت کی اور سارے واقعات لکھ بھیجے تو انھوں نے اس کتاب کو نصاب سے نکلوا دیا، لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یوپی کے جونیئر اسکولوں کے نصاب کی کتاب میں 1972 میں بھی یہ دہرایا گیا ہے۔"[1]

فسادات

1947 میں برصغیر تقسیم ہوا تو ہندوستان، بالخصوص مشرقی پنجاب میں ہندو مسلم فسادات شروع

[1] ترجمے میں صباح الدین عبد الرحمٰن۔ جلد سوم۔ صفحہ 14-311 سے مدد لی گئی ہے۔
http://www.cyberistan.org/islamic/pande.htm (20 Jan 2015)

ہو گئے۔ انتہاء پسند عناصر کی طرف سے ہندو مسلم دونوں کو ہی بے دریغ قتل کیا گیا اور خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ قافلوں کی صورت میں ہجرت آنے والے لوگوں کی گردنیں تلوار سے کاٹ دی گئیں۔ الغرض یہ تاریخ انسانی کا ایک انتہائی بڑا قتل عام تھا جس میں تقریباً پانچ لاکھ کے قریب افراد جاں بحق ہوئے۔ اس وقت یہ فسادات انتہاء پسند عناصر اور سیاسی اشرافیہ کے مفادات کی تکمیل کے لیے ہوئے تھے جو تقسیم کے بعد ختم ہو گئے۔ لیکن ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ چلتا رہا۔ آزادی کے بعد بھی ہندوستان میں ہزاروں فسادات ہوئے جن میں لاکھوں افراد مارے گئے۔ بھارت میں صرف گزشتہ دس سالوں کے دوران فرقہ وارانہ فسادات میں 2500 سے زائد افراد ہلاک ہوئے محض آسام کے فسادات میں جسے نیلی کا قتل عام کہا جاتا ہے، میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2191 جبکہ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق 5000 سے زائد مسلمانوں کا قتل عام ہوا جن میں ضعیف و ناتواں، عورتیں، بچے سبھی شامل تھے۔ اس خطے کی تاریخ میں آئے روز ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہر فساد کے بعد تحقیقاتی کمیشن تشکیل دی جاتی ہیں، لیکن تمام انکوائری کمیشنوں کی رپورٹ کو کبھی منظر عام پر نہیں لایا جاتا۔

ہندوستانی مبصرین کے نزدیک یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہندو مسلم فسادات کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ سیاسی مفادات سے ہے۔ محترمہ بی راجیشوری ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے

اسباب و عوامل پر ایک تحقیقی مقالہ [1] لکھا ہے جسے بھارت کے معروف فکری ادارے Institute of Peace and Conflict Studies (IPCS) نے شائع کیا ہے۔ اس رپورٹ میں محترمہ بی راجیشوری لکھتی ہیں کہ ہندوستان میں ہونے والے ان فرقہ وارانہ فسادات کی اصل وجہ فطری طور پر رونما ہونے والے واقعات واقعات یا مذہب نہیں ہے بلکہ ان میں سے اکثر واقعات کا سبب سیاسی و معاشی مفادات ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات ایک خاص منصوبہ بند سازش کے تحت انجام دیے گئے جس میں علاقائی سیاست اور اقتصادی عوامل نیز ہندتو (Hindutva) کی سیاست بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان فسادات کو بنیاد پر بنا کر سیاسی لیڈران اپنی قوم کے لوگوں کے دلوں میں دوسرے مذہب یا قوم کا ڈر بٹھانے کے لیے جذباتی تقاریر کرتے ہیں تاکہ عوام اپنے آپ کو حقیقت سے زیادہ غیر محفوظ خیال کرے اور پھر یہ سیاسی قائدین فسادات سے خوف زدہ عوام کے سامنے خود کو ان کے مسیحا طور پر پیش کر کے اپنا ووٹ بینک مضبوط بنایا جائے۔ یہ قائدین انھیں دلاتے ہیں کہ اگر عوام نے اسے انتخابات میں کامیاب کیا تو وہ اپنے فرقے کے لوگوں کی حفاظت کریں گے۔

فسادات کے مسئلے کا حل

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ہندوستان میں ہونے والے فسادات کے اصل محرکات تمام تر سیاسی

[1] B Rajeshwari, ***Communal Riots in India*** http://www.thesuratinitiative.com/ (12 Dec 2014)

مفادات ہوتے ہیں، لیکن بد قسمتی سے یہ فسادات مذہب کے نام سے ہی شروع کیے جاتے ہیں تاکہ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر زیادہ سے زیادہ نقصان کیا جاسکے۔ مسجد کے سامنے بت رکھ دیا جائے یا گانا بجانا شروع ہو جائے، عبادت گاہ کے سامنے سے دوسرے مذہبی کا جلوس گزر جائے، کسی دوسرے مذہب والے سے غلطی سے عبادت گاہ کی عمارت کو معمولی نقصان پہنچ جائے؛ بھارت میں ہونے والے اکثر فسادات اسی قسم کی باتوں سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ سبھی واقعات ایسے ہیں جن کا تعلق پوری قوم نہیں بلکہ کسی فرد یا گروہ کے ذاتی عمل سے ہوتا ہے۔ کسی بھی واقعے کا اصل اسباب ٹریس کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصل معاملہ انتہائی آسانی سے حل ہو سکتا تھا مگر سیاسی لیڈیروں نے قومیت کے تصور کے تحت اسے بڑھاوا دیا۔

مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی انفرادی شخص یا گروہ کی غلط حرکات پر خواہ مخواہ پوری قوم سے لڑنا، ان کی عبادت گاہیں مسمار کرنا، ان کی پاٹھ شالاؤں کو نذر آتش کرنا، یہ سب ہمیں پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ ہمارے نفس نے سکھایا ہے۔ اس قسم کا رد عمل ہم اپنی انا اور قومی عظمت کے جس نام نہاد تصور کے زیر اثر کرتے ہیں، ہمارے مذہب کا ان چیزوں سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہمارا تعلق واقعتاً امن و آتشی کے مذہب سے ہے تو ہمارا تعلق بھی ان چیزوں سے نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں ہم فسادات کے مسئلے کا حل ان نکات کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔

- کسی بھی موقع پر قانون ہاتھ میں نہ لیا جائے۔

-

- ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ پر خدا کا تقوی لازم۔ ایک آدمی اگر ہماری ماں بیٹی پر ظلم کرے تو بھی ہم اس کی ماں بیٹی پر ظلم کرنے کے مجاز نہیں۔
- ہمیشہ یہ کوشش کی جائے کہ معاملہ بڑھنے سے پہلے ہی ابتدائی سطح پر افہام و تفہیم سے حل کر لیا جائے۔
- تنازع کی حالت میں اشتعال انگیز تقاریر کے بجائے اس بات کا واضح کیا جائے ہندو اور مسلمان باہم دشمن یا حریف نہیں بلکہ باہم حلیف ہیں۔
- یہ بات سمجھی اور سمجھائی جائے کہ ان فسادات سے نقصان عام لوگوں کا ہی ہوتا ہے، صرف عوام کی ہی جان، مال اور املاک خطرے میں پڑتی ہے اس لیے ہر صورت فسادات نہ کیے جائیں۔
- کسی بھی امر کا فیصلہ قومی تعصبات کے بجائے عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا جائے۔ قوم اور رنگ و نسل عدل میں کسی بھی صورت حائل نہ ہو۔
- دونوں فریقین انا پرستی کے بجائے جذبہ ایثار کا مظاہرہ کریں۔
- دین سے عدم واقفیت کی وجہ سے بعض مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں سے دوری بنا کر رکھنا ہی عین اسلام ہے جبکہ حقیقت یہ ہے مسلمانوں کے لیے ہندو قوم اپنے دین کی دعوت کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کو ان سے محبت و الفت کے تعلقات قائم کر کے اسی طرح حسن سلوک روا رکھنا چاہیے جیسا کہ ہمارے پیغمبر امن

-

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

کسی انفرادی شخص یا گروہ کی غلط حرکات پر خواہ مخواہ پوری قوم سے لڑنا، ان کی عبادت گاہیں مسمار کرنا، ان کی پاٹھ شالاؤں کو نذر آتش کرنا، یہ سب ہمارے پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سکھایا۔ بلکہ یہ ہمیں ہمارے نفس نے سکھایا ہے۔ ہمیں اس بات سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کا ردعمل ہم اپنی انا اور قومی عظمت کے نام نہاد تصور کے زیر اثر کرتے ہیں، اسلام کا ان چیزوں سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہمارا تعلق اسلام سے ہے تو ہمارا تعلق بھی ان چیزوں سے نہیں ہونا چاہیے۔

باب 11: ہندو قوم اور دعوتِ دین

ہندوؤں کو دعوت کیوں ضروری ہے؟

خیر الامم

قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایک خاص منصب اور ذمہ داری دی ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کی صورت میں ہی اس امت کو خیر الامم کا لقب دیا گیا ہے۔ امت کے اس منصب اور اس سے عائد ہونے والی ذمہ داری کو قرآن مجید میں اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

> تم افضل امت ہو تم کو لوگوں کے نفع کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم لوگوں کو بھلی باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے ان کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (سورہ آل عمران۔ آیت 110)

اس منصبِ فضیلت پر اس سے قبل بنی اسرائیل فائز تھے۔ ان سے بھی کچھ عہد و پیماں لیے تھے جن کا ذکر آج بھی بائبل میں اور قرآن مجید میں موجود ہے۔ بنی اسرائیل نے جب فرائض منصبی کو ادا کرنے میں کوتاہی کی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کیں تو اس امت سے امامت چھین کر بنی اسماعیل میں امت مسلمہ کو دے دی گئی۔

-

امت وسط

'وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا'

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے

(البقرۃ۔2:143)

قرآنِ مجید کی اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کی حیثیت امت وسط اور انھیں شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ یعنی لوگوں پر گواہ بتایا گیا ہے۔ یہ اصطلاح کسی قومی فضیلت کو بیان نہیں کرتی بلکہ ایک عظیم ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ یہ آیت کریمہ ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جہاں بھی رہے حق کی شہادت دیتا رہے۔ یہ امت اس بات پر مکلف ہے کہ جب آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت پر گواہی دیں گے کہ اے ربّ میں نے تیرا پیغام امتِ مسلمہ تک پہنچا دیا تھا۔ تب انھیں یہ بھی یاد دلایا جائے گا کہ اس امت کو امتِ وَسَط بنایا گیا تھا تا کہ یہ رہتی دنیا تک دنیا کی قوموں تک اللہ پیغام پہنچائیں اور پھر امت مسلمہ یہ گواہی دے گی کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو ذمہ داری ہم پر منتقل ہوئی تھی اسے بخوبی کرتے ہوئے ہم نے بھی تیری دعوت ان قوموں تک پہنچا دی۔ اس تناظر میں یہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ خاص تقاضا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو کماحقہ بغیر کسی ردوبدل کے اپنی پڑوسی قوم ہنود تک پہنچائے۔

کتمانِ حق کا ظلم

دین اسلام کا یہ ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں نعمت حق سے سرفراز ہوں وہ اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ خود پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول کا بھی مفہوم ہے کہ انسان جو کچھ اچھی چیز اپنے لیے پسند کرے وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔ اسلام ایک نعمت ہے۔ اس کو تسلیم اور اختیار کر لینے کے بعد دوسروں کو بھی اس کی تلقین و نصیحت کرنا اور اور نعمت دوسرے انسانوں تک پہنچانا ہر ایک مسلمان پر لازم ہے۔ کتمانِ حق یعنی حق کو چھپانا اور اس کے اعلان میں غفلت برتنے کو قرآن نے ظلم سے تعبیر کیا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائیں؟ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ (سورۃ البقرۃ۔ آیت 140)

اسی وجہ سے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ جو نعمت خدا نے ہمیں بن مانگے عطا کی ہے ہم اس میں اپنے ہندو بھائیوں کو بھی شریک کریں ورنہ روزِ محشر ہم ظالموں میں شمار ہوں گے۔

حقِ ہمسائیگی

اسلام نے پڑوسیوں کے جو حقوق بتائے ہیں ان میں یہ شامل ہے کہ ہم نہ صرف ان کی دنیاوی ضرورتوں کا خیال رکھیں بلکہ ان کی روحانی ضروریات بھی دعوت و تبلیغ کے ذریعے پوری

کریں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول ہے کہ "اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اُس وقت تک بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے اور پڑوسی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔" بحیثیت قوم ہندو ہمارے ہمسائے کی حیثیت رکھتے ہیں اور دینی حوالے سے ان کی لاعلمی کی ذمہ دار ہم ہیں۔ پر ہم فرض ہے کہ ہم اپنے دین کی دعوت اپنی پڑوسی قوم تک پہنچائیں۔

ہندوؤں کی موجودہ نفسیات اور دعوتی حکمت عملی

تاریخ سے آگہی

ہندوؤں کو دعوت دیتے ہوئے ضروری ہے کہ انھیں ہندو مسلم تعامل کی صحیح تاریخ سے آگاہ کرکے جانبدارانہ تاریخ سے بننے والی منفی ذہنیت کو ختم جائے۔ خاص طور پر موجودہ دور میں تاریخ بیان کرتے ہوئے مندروں کے انہدام اور مسلم بادشاہوں کی جنگوں کو غلط رنگ دے کر سیاست و قومیت کا مسئلہ بنادیا گیا ہے تاکہ ہندو مسلم اتحاد توڑ کر ان میں نفرت قائم رکھی جائے۔ تاریخ کے متعلق صحیح شعور بیدار کرکے اس باطل تصور کی بیخ کنی انتہائی ضروری ہے۔ ایک طرف یہ لازم ہے کہ دونوں قومیں اپنے ہم مذہبوں کو بلاجواز ہیرو کے طور پر پیش نہ کریں تو یہ بھی لازم ہے کہ غیر مذہب سے تعلق رکھنے والی شخصیات پر لگائے جانے والے غلط الزامات کا بھی انکار کریں۔

شمالی ہند میں اسلام بادشاہوں اور افواج کے ذریعے پہنچا جنھوں نے یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند کی برعکس جہاں اسلام تاجر اور صوفیا کے ذریعے پہنچا، شمالی ہند کے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف منفی ذہنیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے شمالی ہند کے ہندوؤں کو دعوت دیتے ہوئے یہ چیز انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

دعوتِ توحید

قرآن مجید میں دعوت کا جو اسلوب پیش کیا گیا ہے اس میں منطقی مکالمے اور توحید کے مشترک پہلو پر گفتگو کرنے کی کافی تاکید کی گئی ہے۔ عقیدہ توحید کو مکالمے کی بنیاد بنانے کی وجہ یہ ہے کہ سبھی نظریات کے اختلاف کے باوجود بھی توحید وہ عقیدہ ہے جو انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ خدا کی صفات اور اس کے وجود سے ہر انسان کم و بیش یکساں عقیدہ رکھتا ہے۔ کوئی باعقل شخص چاہے وہ ہندو ہو کسی اور مذہب سے، خدا کے متعلق کبھی کوئی ناقص بات واضح طور پر نہیں مانے گا، اگرچہ اس کا عقیدہ یا اس کے مذہب کی مقدس کتابوں میں ایسا کچھ لکھا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اگر آپ انہیں پہلے خدا کی صفات پر متفق کرکے دعوت دیں تو یہ دعوت مزید موثر ہو جاتی ہے۔

توہمات اور غیر مناسب تعلیمات سے آگہی

ہندوؤں کی بڑی تعداد اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ کن توہمات پر یقین رکھتے ہیں، نیز

نیوگ، ذات پات اور دیگر امور پر ان کی کوئی تنقیدی فکر نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے ہنود کو اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ عقل و منطق کے میزان میں ان عقائد و نظریات کی کیا حیثیت ہے اور اس میں باہم کس طرح تضاد ہے۔ ہندومت سے متعلق گزشتہ ماڈیول میں ہم اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کر آئے ہیں اور ہر ایک اہم امر کے متعلق تنقید بھی نقل کر چکے ہیں۔

مقدس شخصیات کی بے حرمتی

ایک اور پہلو ہندو مذہبی صحائف میں خود ہندو شخصیات کے بارے میں جو واقعات منقول ہیں وہ انتہائی نازیبا اور گستاخانہ ہے۔ ہم یہ نکتہ بھی دعوت کے دوران رکھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی ہندو واقعی ان شخصیات سے عقیدت رکھتا ہے کہ تو کسی بھی طرح وہ ایسے مذہبی صحائف پر ایمان نہیں رکھ سکتا جو کہ ان مقدس شخصیات کے بارے میں گستاخانہ باتیں بیان کرتی ہیں۔ اس حوالے سے چند مثالیں شیو کے واقعات، کرشن کا مکھن چور، گوپیوں کے ساتھ وقت گزاری قابل غور ہیں۔ ان واقعات کو ہم ہندومت سے متعلق تفصیلی کتاب میں نقل کر آئے ہیں۔

سیاسی مسائل میں پیچھے ہٹنے کی ضرورت

اس حوالے ہم گزشتہ باب میں گزارشات پیش کر آئے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہندوؤں کو دعوت دیتے ہوئے سیاسی نوعیت کے مسائل میں اپنے موقف میں نہ صرف

لچک کا اظہار کریں بلکہ دوسرے موقف کو بھی قبول کرنے کی اخلاقی قوت رکھیں۔ ہمارے سیاسی نظریات کی حیثیت دین میں محض دنیاوی معاملات میں ایک ذاتی تجزیے کی ہے۔ اس ذاتی تجزیے کو اپنے دین کی دعوت کے لیے رکاوٹ بنانے کی روایت ختم کرنا دعوتی اعتبار سے ہمارے لیے لازم وملزوم ہے۔

سنسکرت سیکھنے کی ضرورت

امت کے مذہبی طبقے بالخصوص علوم اسلامیہ کے طلباء اور داعیانِ اسلام میں سے ایسے افراد کو سامنے آنا ہوگا جو سنسکرت سیکھ کر ان کے مذہب کو صحیح طرح سمجھیں۔ یہ کام بظاہر محنت طلب ہے لیکن اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب حضرت زید رضی اللہ عنہ سریانی سیکھ سکتے تھے، البیرونی سنسکرت سیکھ سکتے تھے، مولانا حمید الدین فراہی اور شیخ احمد دیدات سریانی اور عبرانی سیکھ سکتے تھے، تو پھر کیا مانع ہے کہ قرآن و حدیث کا علم رکھنے والے ہمارے نوجوان سنسکرت نہیں سیکھ سکتے۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سنسکرت سیکھنے کا مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دینا یا ان میں سے دلچسپ معلومات حاصل کرنا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ مقصد ہندوؤں کے سامنے دعوت دین کے اس رُخ کی طرف کام کرنا ہے جس طرف اب تک توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ یہ ہماری دعوتی ضرورت ہے کہ ہم ان کی مذہبی زبان سیکھ کر انھیں ان کی کتابوں سے

دعوت دیں۔ انھیں صرف ہندو مذہب کی مقدس کتابوں سے اغلاط و خرافات تلاش کر کے سامنے پیش نہ کریں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مثبت انداز میں اس مذہب کا مطالعہ کر کے ہندوؤں کے سامنے یہ واضح کریں کہ ان کی مقدس مذہبی شخصیات بالخصوص سیدنا نوح علیہ السلام نے جو دین پیش کیا تھا وہ آج ہزاروں برس گذرنے کے بعد دھندلا گیا ہے؛ قرآن مجید آپ کو اسی کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ ہم مسلمانوں کا کام ہے کہ اس بے خبر قوم کو اس کے ماضی سے دوبارہ ملائیں اور انھیں ان کے کھوئے ہوئے انبیاء تلاش کر کے دیں تا کہ یہ لوگ جس غلط شاہراہ پر نکل پڑے ہیں اس سے واپس دین حق کی طرف رجوع کر لیں۔

معروف اصطلاحات کا استعمال

مسلم داعین کی طرف سے ایک غلطی اکثر و بیشتر یہ بھی ہوتی ہے کہ غیر مسلمین کو دعوت دیتے ہوئے عربی و اردو کے ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں اور غیر عربی الفاظ کا استعمال گناہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی غلط فہمی اللہ تعالیٰ کو کسی اور زبان میں پکارنے مثلاً بھگوان، ایشور یا خدا وغیرہ کہنے کو ناجائز سمجھنے کی ہے۔ حالانکہ اس معاملے پر اگر ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دین نے اس بات کی بالکل اجازت دی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو اپنی زبان میں کسی بھی اچھے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> 'اے نبی! انہیں بتادو تم اللہ کہہ کر پکارو یا الرحمن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت۔110)

قرآن مجید کی اس قطعی نص سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر وہ اچھا نام جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے لیے کسی زبان، علاقے یا قوم میں رائج ہے، اس نام سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا بالکل جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے قرآن مجید کو جو ہندی ترجمہ کیا ہے اس میں یہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اسلام صرف عرب و فارس کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے عالم کے لیے ہے۔ دنیا کے جس خطے میں جو بھی زبان استعمال ہوتی ہے ہمیں دعوت دیتے ہوئے اسی زبان میں رائج مناسب اصطلاحات استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم نماز و درود جیسے فارسی کے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں تو ہندی یا سنسکرت کے مذہبی الفاظ استعمال کرنے میں کیا مانع ہے؟ ہماری تنگ نظری کے نتیجے میں اسلامی دعوت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور دعوت کا مخاطب یہ سمجھتا ہے کہ اسے اس کا عقیدہ یا مذہب نہیں بلکہ قومیت تبدیل کرنے کو کہا جارہا ہے اور اسے اجنبیت کا بھی احساس ہوتا ہے جو قبول حق میں بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ مگر یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کسی شخصیت کے نام مثلاً کرشن، رام اور گنیش وغیرہ کو اسم اللہ کے مترادف رکھنا درست نہیں ہے۔

پروپیگنڈہ کا مقابلہ

عصرِ حاضر میں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے سبب میڈیا پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلائی جارہی ہے جس کی وجہ سے مسلمان بالخصوص مذہبی طبقہ تنگ نظر اور دہشت گرد سمجھا جانے لگا ہے۔ دوسری جانب اسلام کے متعلق طرح طرح کے شبہات بھی پھیلائے جارہے ہیں

تاکہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ مسلم داعین کو غیر مسلموں کو دعوت دینے کے ساتھ اس پروپیگنڈہ کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ عام لوگوں خاص طور سے ہندوؤں میں مسلم مخالف ذہن بنانے کی جو کوشش ہو رہی ہے اُس کی صفائی کے لئے ضروری ہے کہ ہندو برادری کو صحیح صورتحال سے واقف کرایا جائے۔

اسلام کی صحیح تعبیر

دورِ حاضر میں اسلام اپنی اصل صورت میں لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہو رہا ہے۔ قرآن و سنت میں اگرچہ یہ موجود ہے لیکن فقہ، تصوف، علم کلام، فلسفہ اور تقلیدی رجحان کے غلبے کی وجہ سے بہت سی ایسی چیزوں کو بھی دین سمجھا جانے لگا ہے جس کی حیثیت دین میں یا تو محض ایک انفرادی رائے کی ہے یا پھر اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ غیر مسلموں کے لیے آج اسلام اور غیر اسلامی اعمال میں فرق کرنا تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ عصرِ حاضر میں اسلام کو جن چیلنجز کا سامنا ہے، ان انفرادی آراء کی بناء پر اسلام پر جو اعتراضات وارد ہو رہے ہیں ان سے خلاصی کے لیے ضروری ہے کہ غیر مسلم اقوام کے سامنے دین کو ہر قسم کی آمیزش سے پاک کر کے صحیح تصویر پیش کی جائے اور بطور دین صرف ان باتوں کو پیش کیا جائے جو فی الواقع دین میں قطعی درجہ رکھتی ہیں۔

-

اخلاص و محبت

آخر میں ہم پوری دردمندی کے ساتھ تمام داعیانِ اسلام سے گذارش کرتے ہیں کہ یہ بات یقینا درست ہے کہ غیر مسلم چاہے ہندو ہو یا کوئی اور؛ جن اعمال و عقائد میں وہ مبتلا ہیں اس سے بیزاری ہمارے ایمان کا حصہ ہے لیکن خدارا غیر مسلموں سے نفرت نہ کریں، ان سے بیزاری کا اظہار ہر گز نہ کریں۔ پروردگار نے ہمیں اپنے دین کی دعوت ان تک پہچانے کے لیے مکلف کیا ہے نہ کہ ان سے جھگڑا کرنے کے لیے۔ اگر ہم ان سے جھگڑا کرنے لگ جائیں تو پھر بھلا کیوں وہ ہماری بات سنیں گے ؟ ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ انھیں پیار و محبت سے دین کی دعوت دیں، ان کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئیں اور اپنی دعوت کی بنیاد نفرت کے بجائے محبت و خلوص اور خیر خواہی کے جذبے پر رکھیں۔

-

حوالہ جات وکتابیات

کتابیات

مقدس کتابیں

1. قرآن مجید
2. حاکم المستدرک، بیروت، لبنان، دار لکتب العلمیہ، 1990
3. محمد بن اسمٰعیل بخاری، الجامع الصحیح، بیروت، لبنان، دارالقلم، 1981
4. بائیبل
5. **رگ وید**، ہندی ترجمہ: رام گووِند ترپاٹھی۔ www.internetarchive.org
6. **رگ وید**، انگریزی ترجمہ: رالف گرفتھ۔ www.sacred-texts.com
7. **یجر وید**، ہندی ترجمہ: گائیتری پریوار۔ http://literature.awgp.org
8. **وید کے سنسکرت متن اس ویب سائٹ سے حاصل کیے گئے ہیں۔** http://www.sanskritweb.net
9. **منوسمرتی**۔ انگریزی ترجمہ: جورج بوہلر۔ www.sacred-texts.com
10. **اپنشد**۔ ترجمہ شنکر بھاشیہ۔ لاہور: نگارشات پبلشرز
11. **پران**۔ www.vedpuran.com
12. آر کے نارائن، **والمیکی مہابھارت**۔ لاہور: نگارشات پبلشرز

13. رام داس چوہان، ٹھاکر سُکھ، مہابھارت، لاہور، پاکستان، بُک ہوم، 2007

14. لالہ سمیر چند جینی۔ **پارس چرتر**۔ ہریانہ: آتمانند جین ٹریکٹ سوسائٹی، ہریانہ، بھارت

15. **Vishnupuranam,** (Based on Professor H. H. Wilson's translation, Manmatha Nath Dutt,) Kolkata: Elysium Press, 1896

16. **Bhagavad-Gita: As it is.** Mumbai: The Bhaktivedanta Book Trust, 1986

17. **Srimad Bhagvatam**. The Bhaktivedanta Book Trust, 1986

18. Mandakranta Bose, ed.**The Ramayana Revisited** (New York: Oxford University Press, 2004)

19. Suryakant Tripathi Nirala, **Mahabharata Hindi**, (Rajkamal Prakashan Publisher) 2010

لغات / انسائیکلوپیڈیا

20. Yaska Acharya, **The Nighantu and Nirukta.** Edited and translated by: LAKSHMAN SARUP, Delhi: Motilal Banarsidas publisher, 1967

21. John Dowson, **A Classical dictionary of Hindu Mythology and Religion, geography history and literature.** 6th Edition, London: Trubner & co.

22. Lionel d. Barnett, **Hindu Gods and Heroes.** New York: e. P. Dutton and company, 1992

23. Monier-Williams, **A Sanskrit-English dictionary.** Oxford : Clarendon Press, 1882

24. راجہ راجیشور راؤ اصرؔ۔ ہندی اُردو لغت۔ سضافہ و مقدمہ سید قدرت نقوی۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان

-

تاریخ و تمدن

25. John Marshal, **Mohenjo-Daro and the Indus Civilization.** New Delhi: Asian Education Service, 1925
26. Rama Shankar Tripathi, **History of Ancient India.** 1st Edition, Delhi: Motilal Banarsidas publisher, 1942
27. Jawahar Lal Nehru, **Discovery of India.** Delhi: Oxford University Press, Century Edition
28. T.R. Sesha Iyengar, **Dravidian India.** Delhi: Asian Educational Service, 1925
29. Ekta Singh, **Caste System in India**. Delhi: Gyan Books, 2005
30. Abbe J.A Dubois, **Hindu Manners, Customs & Ceremonies.** 3rd Edition. Oxford: The Clarendon Press, 1960
31. Saqi Musta'd khan. **Maāsir-I-'Ālamgiri.** Translated by Sir Jadu-Nath Sarkar, Calcutta: Bibliotheca Indica, 1947
32. Iswari Prasad, ***A Short History of Muslim Rule in India,*** Ed. II, Allahabad: Indian Press Ltd.
33. S.M. Jaffar, ***The Mughal Empire from Babar to Aurangzeb,*** (Peshawar: S Muhammad Sadiq khan Publisher, 1936
34. Dr Tara Chand, ***Influence of Islam in Indian Culture,*** Allahabad: Indian Press Limited
35. Sailendra Nath Sen, ***Ancient Indian History and Civilization***, Dehli New: Age International, 1999

36. اے ایل باشم، **ہندوستانی تہذیب کی داستان۔** لاہور: نگارشات پبلشرز

37. محمد اسحاق بھٹی، **برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش۔** ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔(1990)

38. ڈاکٹر گستاولی (موسیو) لیبان فرانسیسی، **تمدن ہند۔** اردو ترجمہ: مولوی سید علی بلگرامی۔ مطبع شمسی۔ آگرہ: بھارت

39. ڈاکٹر مسعود احمد۔ مقدمہ، **تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات از ڈاکٹر تاراچند۔** مترجم: ڈاکٹر مسعود احمد۔ مجلس ترقیٔ ادب۔ لاہور۔1964

40. رائے بہادر مہامہوپادھیائے۔ **قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب۔** ترجمہ: منشی پریم چند۔ لاہور: فکشن ہاؤس

41. قاضی اطہر مبارک پوری۔ **عرب وہند، عہد رسالت میں۔** لاہور: تخلیقات پبلشر۔(2004)

42. کنور محمد اشرف۔ **ہندوستانی معاشرہ، عہد وسطیٰ میں۔** مترجم: قمر الدین۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ (1989)

43. مفتی شوکت علی فہمی۔ **ہندوستان پر اسلامی حکومت۔** سٹی بک پوائنٹ، کراچی(2005)

44. سید سلیمان ندوی۔ **عرب وہند کے تعلقات۔** لاہور: مشعل بکس

45. شیخ محمد اکرام۔ آبِ کوثر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

46. سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ **ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری۔** عباد پبلیکیشنز۔ لاہور(2010)

47. **مغلوں کا دورِ حکومت اور ان کا زوال۔** تلخیص و ترجمہ: محمد زاہد ملک۔ اضافہ جات: بابر جاوید۔ مشتاق بک کارنر، لاہور

48. **فتح نامہ سندھ، عرف چچ نامہ۔** مصحح: نبی بخش خان بلوچ، مترجم: اختر رضوی۔ جامشورو: سندھ ادبی بورڈ۔(2008)

دیگر کتب

49. Chandrasekharendra Saraswati, **Hindu Dharma: The universal way of life.** Mumbai: Bhartiya Vidya bhavan, 1995

50. Kedar Nath Tiwari, **Comparative Religion.** Delhi: Motilal Banarsidas Publ. 1983

51. Sri Swami Sivananda, **All about Hinduism.** Online WWW Edition, 1997 www.SivanandaDlshq.org (ac. 22 May 2012)

52. Jawahar Lal Nehru, **Towards freedom: The Autobiography of Nehru.** New York: John Day Company, 1936
53. Arvind Sharma, **The Study of Hinduism.** USA: University of South Carolina Press, 2003
54. M.K Gandhi, **Essence of Hinduism.** 2nd Edition, Ahmadabad: Navajivan Publishing House, 1996
55. Dr B.B Paliwal, **Message of the Vedas.** Delhi: Diamond Pocket Books, 2006
56. Jagat Motvan, **None but India.** USA: Universe Publishers, 2011

57. سوامی دیانند سرسوتی۔ **رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا۔** اردو ترجمہ نہال سنگھ۔ میرٹھ: مطبع وِدیا درپن۔(1898)

58. کیخسرو اسفندیار۔ **دبستانِ مذاہب۔** لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔(2002)

59. حمید اللہ، ڈاکٹر محمد، خطبات بہاولپور، لاہور، پاکستان، بیکن بکس، 2013

60. مولانا مناظر احسن گیلانی۔ **سوانح قاسمی۔** حصہ دوم۔ دارالعلوم دیوبند۔ بھارت۔

61. عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی۔ **تفسیر در منثور۔** اردو ترجمہ: پیر محمد کرم علی شاہ ازہری۔ ادارہ ضیاء المصنفین۔ بھیرہ شریف۔(2006)

62. حافظ عمادالدین ابوالفدا اسماعیل ابن کثیر۔ **قصص الانبیاء۔** اردو ترجمہ: مولانا ابو طلحہٰ اصغر مغل۔ ادارہ دارالاشاعت کراچی۔

63. اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ۔ طبع اول، زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی، لاہور(1968)